کھیل ادھورا

افغان ادیبوں کے منتخب افسانے

مترجمان:

عبدالقیوم کریم اور شمیم احمد قریشی

جولائی ۱۹۹۵

ادھورا کھیل

افغان ادیبوں کے منتخب افسانے

PROPERTY OF
ACKU
6695

عبدالقیوم کریم اورشمیم احمد قریشی

کے ترجمے

جولائی ۱۹۹۵

جملہ حقوق بحق ناشرمحفوظ ہیں.

تعارف

کتاب کا نام : ادھوراکھیل

ترجمہ از : عبدالقیوم کریم اور شمیم احمد قریشی

خطاط : مزمل

ناشر :عبدالقیوم کریم

تاریخ : جولاے ۱۹۹۵ ع - سرطان ۱۳۷۴ ش

کمپیوٹرگرافیکس : عبدالحی سحر

قیمت : RS 20

فهرست

نمبر- کہانی ----------	رائٹر	صفحہ
دیباچہ		
رائٹرز کے بارے میں ...		
۱- سانپ ----------	رھنورد زریاب	۱ - ۱۰
۲- موسکا ----------	امین افغانپور	۱۱ - ۲۰
۳- دیوارکی دراڑ ----------	اکرم عثمان	۲۱ - ۲۷
٤-فرشتے کاشکار----------	سپوژمے زریاب	۲۸ - ۳۷
٥- ادھورے راستے----------	زرین انزور	۳۸ - ٤٥
٦- ادھوراکھیل ----------	قیوم کریم	٤٦ - ٤٨
۷- کالاگھوڑا ----------	اسداللہ حبیب	٤۹ - ٥۲
۸- اھریمن دن میں بھی نظر آتے ہیں-	اکبر کرگر	٥۳ - ٥۸

اهداء :

ان ادیبوں کے نام جو
انسان کی بھلائی ،
انسان سے محبت ،

اور

انسانو ں کے دلوں میں ایك دوسرے سے محبت کے فروغ
کے لئے لکھتے ھیں !

دیباچہ

افغانستان میں بہت سے اردو آثار کے ترجمے پشتو اور دری میں شائع ہو چکے ہیں جن میں سے رابیندر ناتھ ٹیگور کی کہانی «کابلی والا» اور انکے اشعار بہت معروف ہیں اور آج تک دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں. اردو ادب کو متعارف کرانے کے سلسلے میں مذکورہ ترجموں کے علاوہ اور مختلف ادیبوں کے آثار کے ترجمے کہیں کہیں چھپ چکے ہیں جنہیں ہمارے عوام نے پسند کیا ہے اور ان کی پسندیدگی کی ایک اہم وجہ میرے عقیدے کے مطابق اہل زبان اردو اور ہمارے عوام کے درمیان ثقافتی رابطہ اور نزدیکیاں ہیں جن سے مختلف وجوہات کی بنا پر انکار نہیں کیا جاسکتا.

اس سلسلے میں اپنے بزرگ ادیبوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اردو ادب سے دلچسپی کی بنا پر میں نے بھی اردو ادب کے بعض تخلیقی آثار کو ترجمہ کرنے کی جسارت کی اور اردو زبان کے مانے ہوئے کہانی نویس منشی پریم چند ، رابیند ر نا تھ ٹیگور کے ڈاک گھر اور راجا کے نام سے دو ناٹکوں اردو ادب کے متعلق جناب علی سردار جعفری کے انٹرویو ،.بچوں کے لئے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے چند افسانوں، سعادت حسن منٹو، ڈاکٹر اظہار الحسن ، فکر تونسوی ، کیول دھیر، کرشنا کماری اور دیگر مختلف ادیبوں کی کہانیوں کو پشتو اور دری ادب کے قارئین کو پیش کیں . پھر اردو زبان کے قارئین کو افغانستان میں پشتو اور دری ادب کے چند نمونے پیش کرنے کا خیال آیا ،اس لئے افغان ادیبوں کے چند کہانیوں کو ان کی ادبی اہمیت اور لکھنے کے انداز پر مبنی انتخاب کیا اور انہیں انڈین رائٹر جناب شمیم احمد قریشی کے ساتھ مشترکہ طور پر ترجمہ کیا جو پیش خدمت ہیں. اردو ادب کے قارئیں سے گذارش ہے کہ اس مجموعے کی چھپائی میں اردو گرائمر کے لحاظ سے احتمالی پیش آنے والی غلطیوں کو نظر انداز کریں ، عین نوازش ہوگی.

باعرض حرمت

عبدالقیوم کریم

۲ جون ۱۹۹۵ - پشاور

۳- کانڈیڈیٹ اکیڈیمیشن ڈاکٹر محمد اکرم عثمان ۱۹۳۷ میں ہرات میں پیدا ہوئے .اعلی تعلیم پولیٹیکل سائنس اور قانون میں‌کابل اور تہران میں پائی .ان کی کہانیاں ایران ، بلغاریہ ، سابق سویٹ یونین اور جرمنی میں چھپی ہیں، ان کی کہانیوں کے تین مجموعے شائع ہوچکے ہیں اور ان کی دوکہانیوں پر فلمیں بھی بن چکی ہیں. اکرم عثمان ۳۰ سے زیادہ برسوں سے دری میں لکھتے ہیں.دیوار کی دراڑ انہیں‌کی کہانیوں میں سے ایک ہے.

٤- مسز سپوژمے زرباب نے فرشتے کاشکار دری میں لکھے . وہ ۱۹۵۰ میں کابل مں پیدا ہوئے. یونیورسٹی کی تعلیم پوری کرنے کے بعد ادبیات میں ام ،اے کرنے کے لئے فرانس تشریف لےگئیں .اب تك دری زبان میں ان کے افسانوں کے دومجموعے اورکئی دیگرکتابیں شائع ہوچکی ہیں.

۵- ادھورے راستے کا رایٹر زرین انزور ۱۹۵٤ میں‌ننگرھار صوبے کے ڈسٹرکٹ مومند درہ کے گردی غوث نامي گاوں میں پیدا ہوئے. ۱۹۷۷ میں انھوں نے کابل یونیورسٹی سے جرنالیزم میں بی ، ائے کیا. ۱۹۷۳ سے ان کی کہانیاں پشتو میں چھپنے لگے اور اب تك ان کی چھ ادبی اور تنقیدی کتابیں اور کہانیوں کے دومجموعے چھپ چکے ہیں .

٦- ادھوراکھیل کو میں نے لکھا اور اسے کہانی کانام دیا. ۱۹٦۰ میں ننگرھار صوبے کے سرخرورد ڈسٹرکٹ میں پیداھوا ہوں . کابل یونیورسٹی سے سیول انجنیرنینگ میں بی ،اس سی اور رورکی یونیورسٹی

- انڈیا سے ایم ، ای کیا. جوکچھ انجنیرینگ کے ذریعے نہیں کہہ پاتا، چند جملے لکھ کر ان کے ذریعے اپنے خیال کا اظہار کرنے کی کوشش کرتاھوں.رابیندرناتھ ٹیگور، کرشن چندر، منشی پریم چند ،
سعادت حسن منٹو،علی سرداد جعفری ، ڈاکٹر ذاکر حسین،اظہار الحسن عا صی سعیداور اردو ادب کے بعض دیگر ادیبوں کی ڈراموں ، کہانیوں طنزوں، چٹخاروں‌اور انٹرویوزکوپشتو اوردری میں ترجمہ کرچکا ھوں.
میرے تراجم میں سے منشی پریم چند کی چند کہانیوں کا پشتو ترجمہ ۱۹۸۸ میں شائع ھوا جوکے نتیجے میں مجھے ترجمے کاایوا رڈ بھی دیاگیا.

۷- اسداللہ حبیب ((کالاگھوڑا))کارائٹرھے . وہ ۱۹٤۱ میں کابل میں پیدا ھوئے . کابل یونیورسٹی سے دری ادب میں بی ، اے کیا اور۱۹۷۳ میں ماسکو یونیورسٹی کے مشرقی زبانوں کی انسٹیٹوت سے ڈکٹورا لیا. حبیب کا پہلا افسانہ ۱۹٦۳ میں شائع ھوا جس کے نتیجے میں ان کو ایوارڈ بھی دیاگیا.ان کی کئی کہانیوں کو دیگرزبانوں میں بھی ترجمہ کیاگیاھے.

۸- اس مجموعے کی آخری کہانی کو محمداکبر کرگرکی کہانیوں میں سے لیاگیاھے .کرگر ۱۹۵۳ میں کنڑ صوبے کے مزاردرہ گاوں میں پیدا ھوئے. ۱۹۷۷ میں کابل یونیورسٹی سے فلسفے اور سوشیل سائنس میں بی ۔اے کیا. انھوں نے ۱۹۷۳ سے کہانی لکھناشروع کیا. اب تك ان کے افسانوں کے دومجموعے اورکئی دیگر کتابیں شائع ھوچکی ھیں.

عبدالقیوم کریم
۱۹۸۸ - کابل

PROPERTY OF ACKU 6695

سانپ

لندن سفید رنگ کے دھند میں ڈوباھواتھا.ھرجگہ دھندہی دھند تھی ، سفید رنگ کی دھند.سہ پہر.کاوقت تھا اوردم بدم اندھیرا ھوتا جارہاتھا.تاریکی کے ساتھ ساتھ دھند بھی سرمئی رنگ کی ھوتی جارہی تھی . بارش کی پھوار پڑرہی تھی. پھوار اتنی باریك تھی کہ وہ بھی دھند میں مل جاتی تھی اورآدمی فقط اس کی رطوبت کوہی محسوس کرپاتاتھا.

دریائے ٹیمز جسکا رنگ دھند نے سرمئی کردیاتھا، بغیر کسی آواز کے آگے کی طرف گھسٹ رہاتھا اوروہ پل جسواس دریاکے دونوں کناروں کوملاتاتھا، اس دھند میں یہ مشکل نظر آرہا تھا. اس وقت میں اس پل سے گذر رہاتھا.

میں نے پل کے دوسرے سرے پرنظرڈالی،دھند کے بادل سے وہ آخری سراچھپ ساگیاتھا. مجھے ایسالگاکہ گویا خواب دیکھ رہاھوں. ایک بار پھرپل کے دوسرے سرے کی طرف نظریں اٹھائیں لیکن پھر بھی وہ نظرنہ آیا. دھند تھی . میں نے اپنے آپ سے کہا:

- یہ بھی مستقبل کی طرح نظرنہیں آرہاھے.

اسی وقت میں نے ایک شخص کودیکھاجوپل کی دیوار پرجھکاھوادریاکو دیکھ رہاتھا. میرے پاؤں کی چھاپ سن کراس نے اپنے آپ کودرست کیا. وہ ایک لمبے قدکاآدمی تھا.اس کے شانے اندرکوجھکے ھوئے تھے.کسی حد تك

کبڑانظر آرہاتھا۔لمبااوورکوٹ پہنے ہوئے اورپیٹ کواپنی آنکھوں تک مڑے ہوئے تھا۔ میں چاہتاتھاکہ اس کے پہلوسے بے سروصدا گذرجاؤں کہ اس نے کہا۔

- دیکھتے ہو،بالکل سانپ کی طرح چل رہاھے۔

میں رک گیا۔آدمی نے ہاتھ سے دریا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، پھر کہا:

- بالکل سانپ کی طرح چل رہاھے۔

ذرا سامیں نے بھی پل کی دیوار سے اس دھند میں سے دیکھا کہ دریاکاپانی بغیر کسی آوازکے آہستہ آہستہ آگے چل رہاھے۔

اس شخص نے اپنے ہاتھ پل کی دیوار پرمارے اورکہا:

- کیا تمہیں پل پسند ھے؟

مجھے اس کاسوال پسند آیا۔ میں مسکرایااورکہا:

- ھان ، مجھے پل اچھا لگتاھے۔

اس شخص نے اپنا منہ میرے کان کے قریب لاکرکہا:

- یہ دنیا پل کی طرح ھے ، جس پرسے گذرجاناہی چاہئے ،نہ یہ کہ اس کے اوپرگھربناناا۔

میں پھر مسکرآیااوزکہا:

- یہ ایک مشرقی عقیدہ ھے۔

اس شخص نے میری ہاں میں ہاں ملاکرکہا:

- ٹھیک ھے،یہ ایک ھندوستانی عقیدہ ھے۔ جسکومیں نے ھندوستان میں

جانا. میں نے پوچھا:

- کیا تم ھندوستاں جاچکے ھو؟

وہ پھر اپنا منہ میرے کان کے قریب لایا اورکہا:

- میں وہاں کام کرتاتھا.

اس کے منہ سے شراب کابھپکااُٹھ رہاتھا.ہم دونوں چلنے لگے. یہ شخص مسلسل باتیں کئے جارہاتھا اور اس کی باتیں ھندوستاں کے بارے میں تھیں، یہاں تك کہ ہم ایک گھرکے قریب پہنچ گئے یہ دومنزلہ گھرتھا.اس کی کھڑکیاں سڑك کی طرف کھلتی تھیں اور اس میںایک چھوٹا سباغ تھا.اس گھرکی دیواروں کارنگ سرمئی تھا.دھند کے رنگ کاجو اس وقت سب جگہ پرچھایاھواتھا.آدمی رك گیا اور کہا:

- آئیے ،یہ میرا ہی گھرھے.

مَیں اس کے پیچھے پیچھے ھولیا.اس نے دروازہ کھولا اورہم داخل ھوگئے. سب جگہ تاریکی ہی تاریکی تھی اورایک خاص قسم کی مہك آرہی تھی. میں نے پوچھا:

- یہ مہك کاھے کی ھے؟

-زعفران کی خوشبوھے . اس خوشبوسے مین ھندوستاں میں آشنا ھوا تھا. یہ خوشبومجھے بہت اچھی لگتی ھے.

جس وقت اس نے بتی جلائی میں ایک دم حیراں ھوگیا، ھرطرف سانپوں کی تصویریں تھیں. مختلف قسم کے سانپوں کی تصویریں. جب اس نے مجھے متعجب دیکھا، زورسے ہنسا. ہنستے ھوئے اس کے جھکے ھوئے

کند ھے ہلنے لگے . اس حال میں اس نے کہا:

- مجھے یہ اچھے لگتے ہیں. مجھے یہ بہت پسند ہیں.

آہستہ آہستہ وہ سیڑھیاں چڑھنے لگااورمیں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلاگیا.اب اس نے ہنسناہند کردیاتھا. اس کاسانس تیزی سے چل رہاتھا. اس نے کہا:

- کیا تمہیں معلوم ھے ، ھندوستاں میں لوگ سانپوں‌کی عبادت کرتے ہیں؟

میں نے پوچھا:

- آپ کوسانپ کی کونسی اداپسند ھے ؟

اس نے جواب نہ دیا. ایک کمرے کادروازہ کھولا اورہم دونوں اس کے ندرچلے گئے .یہ کمرہ بھی مختلف قسم کے سانپ کی تصویروں اورمجسموں سے بھرا ھوا تھا. ھرطرف سانپ ہی سانپ، ھرچیزسانپ کی شکل کی تھی، یہاں تک کہ پلنگ اور کرسیوں کے پائے بھی سانپ کی شکل کے تھے.

اس شخص نے ہم دونوں کے لئے گلاس میں وہسکی انڈیلی .کچھ یرکھڑکی کے شیشے سے باہر جھانکتارہا.سب جگہ دھند تھی اور کچھ نظر نہیں آتاتھا. وہ میری طرف پلٹا اور گلاس کوایک ہی بار میں خالی کرتے ہوئے کہا:

- جانتے ھو، چالیس سال پہلے میں ھندوستاں میں تھا.مجھے ریل کے مروے کے لئے وہاں بھیجاگیاتھا. اس وقت میری عمر تیس سال تھی.

اس وقت اس شخص کے سرپر ہیٹ نہ تھا اوراس کے سفید بال بجلی کی

روشنی میں چمک رہے تھے .اس نے کہا:

- یہ ریل ایک جنگل سے گذرنے والی تھی. ہماری ٹکڑی اس جنگل کے قریب خیمہ زن تھی اورہم نے روزمرہ کے کاموں کے لئے نزدیک کے گاؤں سے لوگوں کو ملازم رکھاھوا تھا. انہیں میں سے ایک «رامو» تھا.دبلاپتلاگہرے سانولے رنگ کا.دوسرے گاؤں والوں کی طرح اس نے بھی فقط ایک زرد رنگ کی لنگوٹی باندھی ہوئی تھی. اس کے کالے بال اس کی آنکھوں کی طرح چمک رہے تھے. اس کی آنکھوں میں ایک خاص چیز نظرآرہی تھی. اس کی جیسے کہ کوئی رازھویاکوئی کہانی.ایک ناتمام کہانی. مجھے راموپسند آگیا.وہ کبھی نہیں ہنستاتھا. وہ بڑے صبراور حوصلے کا آدمی تھا. اس کی خاموشی میں ایک عظمت پوشیدہ تھی. گھنٹوں میرے نزدیک بیٹھتا اورمیں اسے لندن، وھاں کی تھذیب اور کارخانوں کے بارے میں باتیں کرتارہتا... وہ بڑے غورسے میری باتیں سنتا. صرف میری باتوں کے آخر میں معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے کہتا:

-صاحب ، یہ دنیا توایک پل کی طرح ھے جس سے گذرجانا ہی چاہئے ، نہ یہ کہ اس پرگھربنانا.

اس کی اس بات کامیرے پاس کوئی جواب نہ تھا. میں اس کی آنکھوں کی طرف جن میں ایک ناتمام کہانی پنہاں تھی، دیکھتا اور وہ بھی میری طرف اس پرعظمت خاموشی سے دیکھتا رہتاتھا. ایک دفعہ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ شادی کیوں نہیں کرتا.اس نے کہا:

- صاحب ، یہ دنیا توایک پل ھے . اس پرسے گذرجاناچاہئے نہ یہ کہ اس

پر گھر بنانا.

اس کی انکھوں میں راز ہی راز پنہاں تھے .ایک روز میں جنگل سے گذررہاتھا. رامو بھی میرے پیچھے پیچھے آرہاتھا .اچانك میںنے ایک پھن دارسانپ کو دیکھاکہ جھاڑی میںسے ہماری طرف حیرت سے دیکھ رہاتھا. میں ڈرگیا اورمیں نے فوراً ہی اپنی بندوق کی نالی اس کی طرف کردی.ایک دم رامو نے بندوق کی نال زورسے دوسری طرف گھماتے ہوئے کہا:

- صاحب اس کومت مارنا.

میں نی پوچھا:

-کیوں ؟

اس نے کہا:

- شاید یہ نرھو اور اس کی مادہ آپ سے اس کاانتقام لے.

میں نے دوبارہ سانپ کی طرف دیکھاجواسی طرح گھور گھورکے ہماری طرف دیکھ رہاتھا. مجھے لگاکہ اس کی آنکھیں بھی رامو جیسی ہیں اور ان میں بھی کوئی راز پنہاں ھے .کوئی ناتمام کہانی چھپی ہوئی ھے. رامو اسی طرح اپنی پرعظمت خاموشی کے ساتھ میری طرف دیکھ رہاتھا.میں نے اس سے پوچھا:

- تویہ باتیں کہاں سے جانتا ھے ؟

اس نے جواب دیا:

- گاؤں میں ہم سب یہ باتیں جانتے ہیں.

میں ہنس دیا. ایک روز پھر ہم جنگل سے گذر رھے تھے.ایک چیتے کو

دیکھا.میں نے اس پرگولی چلادی. چیتا جھاڑیوں میں چلاگیا. میںنے ان جھاڑیوں میں زرد رنگ کاجسم دیکھا. سوچاکہ شاید چیتا زخمی ہوگیا. میں نے پھر نشانہ باندھااورگولی چلائی .ایک شخص کی چیخ سنی. میں ادھر بھاگا.دیکھاکہ ایک سانولاھندوستانی پیلے رنگ کی لنگوٹی کے ساتھ خون میں نہایا ہواھے.

رامو جھکا.اپنی اسی پرعظمت خاموشی کے ساتھ اس نے اس جسم کودیکھا اورسراٹھاتے ہوئے کہا:

- صاحب ،یہ میرا بہنوئی ھے.

میں نے پریشانی میںاس سے کہا:

- میں نے یہ کام قصداً نہیں کیا.

رامونے سرہلاتے ہوئے کہا:

-صاحب، وہ پل سے گذرگیا.

رامو اس لاش کواپنے ساتھ گاؤں لے گیا اورکئی دن تک واپس نہ آیا.ایک رات کومیں خیمے میں بستر پرلیٹاھواتھا. شمع جل رہی تھی لیکن مجھے نیند نہیں آرہی تھی. رات آدھی گذرچکی تھی. میں نے دیکھاکہ خیمے کے کپڑے کو کسی نے چھری سے پھاڑا.یہ ایک عورت تھی. وہ اندر آگئی. ڈرکی وجہ سے میرا جسم بے حرکت ہوگیا.اس جواں عورت کی آنکھیں شمع کی روشنی میں چمک رہی تھیں بالکل اسی طرح جیسے اس جنگل والے پھن دار سانپ کی یا رامو کی. ان آنکھوں میں بھی راز پنہاں تھے او ر ایک ناتمام کہانی ان میں پنہان تھی.مجھ میں ہلنے کی طاقت نہ تھی جیسے کہ مجھ

پرکسی نےجادو کردیا ہو. موت میرے سامنے کھڑی تھی. وہ عورت آہستہ آہستہ میری نزدیک آئی اور اس نے اپنا چھری والا ہاتھ ہوامیں بلند کیا. چھری روشنی میں چمکی لیکن اسی وقت کوئی دوسرا شخص خیمے میں آگیا. اس نے عورت کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑلیا. اس عورت نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن اسی کشمش میں شمع گرگئی اور خیمے میں تاریکی چھاگئی.میںنے بعد میں چیخ کی آوازسنی اوردیکھاکہ کوئی خیمے سے باہربھاگ گیا. جب شمع روشن کی تو میں نے دیکھارامومیرے بستر کے قریب پڑاھواھے اوراس کے سینے سے خون نکل کربہرہاھے. اس وقت اس کی آنکھوں میں نہ وہ روشنی تھی اور نہ وہ راز. میں اس کے قریب بیٹھ گیااور رامو نے آہستہ سے کہا:

- صاحب اس عورت سے خبرداررہنا.یہ میری بہن ھے . تم نے اس کے شوھرکومارڈیاھے اور وہ تم سے اپنے شوھر کابدلہ لے گی.

کچھ لمحوں کے لئے وہ خاموش ھوگیا. اب اس کاچہرہ سپاٹ تھا.کسی قسم کادرد وکرب نظر نہ آتا تھا.آہستہ آہستہ اس نے کہا:

- صاحب ، میں بھی اس پل سے گذرگیا.

میں نے پہلی اور آخری مرتبہ اس کے چہرے کے اوپرمسکراہٹ دیکھی.پھر وہ مسکراہٹ ختم ھوگئی اور وہ مرگیا. اس کے دوسرے دن میں اس عورت کی تلاش میں گاؤں گیا . اس کانام گیتا تھا اور وہ انیس سال کی تھی.اس کاکوئی رشتہ دارنہ تھا.میں نے اپنی ملازمت ترک کردی .میں نے وایسرائے سے اجازت لی اوراسے اپنے ساتھ لندن لے گیا.میں نے اس کو

سکھانے سمجھانے کی جتنی بھی کوششیں کیں وہ بے نتیجہ رہیں. وہ ایک لفظ بھی نہیں بولتی تھی اور ہمیشہ خاموش رہتی تھی. رامو کی طرح میں نے اسے بھی کبھی ہنستا نہ دیکھا.ہر روز وہ اسی کھڑکی میں بیٹھ جاتی اور دریا کودیکھتی رہتی.بعد میں اس نے مجھ سے قلم، کاغذ اور دوات مانگ لی اورتصویریں بنانا شروع کی لیکن وہ سب تصویریں سانپوں کی تھیں، مختلف قسم کی سانپوں کی. یہ ساری تصویریں جوتم دیکھ رہے ہو،اس کی ہی بنائی ہوئی ہیں . تمام دن تصویریں بناتی رہتی اور دیواروں پر لگاتی رہتی .

ایک رات کچھ آوازیں باورچی خانے سے سنائی دیں تومیں بیدار ہوگیا.بعد میں میرے کمرے کادروازہ کھلا اور گیتا اندرآگئی .باورچی خانے کی چھری اس کے ہاتھ میں تھی .میں نے جلدی سے بتی جلائی اور دیکھا کہ اس کی آنکھیں چمک رہی ہیں، بالکل اس پھن دار سانپ کی طرح جسے میں نی جنگل میں دیکھاتھا.اس کے چہرے پرکسی قسم کے غم وغصے کے آثار نہ تھے.وہ میرے نزدیک آگئی. اسے اس حالت میں دیکھ کر میں اپنی پوری قوت کے ساتھ چیخا:مدد!

میری آوازکمرے میں گونج اُٹھی اور شیشے لرزنے لگے. گیتاوہاں سے بھاگ گئی اور اپنے کمرے میں چلی گئی .میں بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگا اور اس کے کمرے کوباہر سے تالالگادیا.اس کے بعد سے میرا معمول بن گیا کہ رات کومیں اس کے کمرے میں تالالگادیتا. پھرگیتا روز بروز پژمردہ سے پژمردہ ترھوتی گئی. اس نے تصویریں بنانی بھی چھو ڑدیں. اب

وہ صرف شیشے کے پیچھے سے دریا کو دیکھتی رہتی تھی.

ایک روزجومیں گھرواپس ایا توگیتا گھرمیں نہ تھی . ھرجگہ اس کو تلاش کیا لیکن کہیں نہ ملی . میں نے پولیس میں رپورٹ کی تو پولیس کو اس کایے جاں جسم یہاں سے بہت دور دریاسے ملا.

اس شخص نے دوبارہ اپنا گلاس خالی کردیا.میں نے دیکھا اسکی آنکھیں آنسوؤںسے تر ہیں. اس حال میں اس نے کہا:

- میں قاتل ھوں!

میںنے وہاں سے اٹھتے ھوے کہا:

- اچھا تومیں چلتا ھوں.

وہ میرے ساتھ نیچھے آیا. اب سب جگہ تاریکی ہی تاریکی تھی اورسڑک کے چراغ اس دھند میں چمک رھے تھے. پل پرجب ہم پہنچے تو اس نے کہا:

- دنیا ایک پل کی طرح ھے.

وہ وہیں ٹھہر گیا. میں اس سے چند قدم فاصلے پرجاکر رک گیا اور اسے دیکھاکہ وہ پل کی دیوار سے جھکاھوا دریا کے پانی کو دیکھ رہاھے. میں نے اپنا راستہ لیا. اب بھی بو ندیں برس رہی تھیں .اس دھند میں، میںنے اپنے پیچھے اس شخص کو دوبارہ سنا کہ بلند آواز میں مجھ سے پوچھ رہاھے:

- تمہیں پل کیوں پسند ھے ؟

میں نے جواب نہ دیا.اب میں پل کے دوسرے کنارے تک پہنچ چکاتھا.

موسکا

اس کی بڑی بڑی سیاہ خمار آلود آنکھیں مجھے بے ساختہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اور میں اس کے قریب چلاجاتاھوں، اسے بغور دیکھتاھوں، کہیں ایسانہ ھوکہ میں نے غلطی کی ھو. اس کی آبروئیں بھری بھری اور ایک دوسرے سے ملی ھوئی ہیں،اس کی ناک ستواں، باریك جس میں اس نے لونگ پہنی ھوئی ھے ، اس کاچہرہ گول مہتابی اور گردن لمبی صراحی دارھے . اس کے ھونٹ سرخ اور سرکاٹیکہ اس کے ماتھے پہ سجاھواھے. اس کی لمبی چوٹیاں اس کے بازوؤں پر بید مجنوں کی طرح لیٹی ھوئی ہیں.اس کی سیاہ قمیض کاگریباں مسگ گیاھے اورمیری نگاہیں قمیض کے نیچھے کی خوبصورتی پرجمی ھوئی ہیں. اگر چہ وہ مسکرارہی ھے لیکن مجھے اس کے مسکراتے ھوئے ھونٹوں پرایک عجیب سی تلخ مسکراہٹ نظرآتی ھے. دورعقب میں ایک سیاہ رنگ کا خیمہ نظر آرہاھے جہاں ایک اونٹ بیٹھا ھوا جوالی کررہاھے. ایک بڑھیا سیاہ توے کے اوپر روٹی پکارہي ھے اورخیمے کے داہنی طرف کچھ بھیڑیں ادھرادھر مٹر گشت کررہی ہیں اورایسا لگتا ھے کہ اس کے برابر کھڑے بڑے کتے کی نیت ان بھیڑوں کی طرف کچھ اچھی نہیں ھے. ہاں یہ خانہ بدوش ھے .میری خانہ بدوش. میرے ملك کی خانہ بدوش کہ شاید اس کادل اس فریم سے بھرچکاھو. وہ پھرمیری طرف دیکھتی ھے جیسے کہ وہ چاہتی ھے کوئی اسے بلائے. میں اسے

بلاتاھوں:

- نکل آ ! تاکہ ہم باتیں کریں. میرادل بھی اس جگہ سے بھرچکاھے . میں بھی تمہارا ہم وطن مسافرھوں.

وہ مجھ سے پوچھتی ھے:

- تم یہاں کیاکرتے ھو؟

جواب دیتاھوں:

- نہیں معلوم ،یہ دنیا بڑی ھے. میں بھی تمہاری طرح اس میں سرگرداں ھوں.

پھروہ تلخ ہنسی ہنستی ھے. یاتووہ ڈرتی ھے یاشرماتی ھے کہ اس میں سے باہر آئے. یاشاید اس بھیڑ بھڑکے کو یا اس ہال کی گرمی، سگرٹوں کے دھوؤں، وہسکی کے بھپکوں ، مردوں اور عورتوں میں سے اٹھتی ھوئی تیزخوشبوؤں اور پسینوں کے لپٹوں کووہ برداشت نہیں کر سکتی، شاید اس ہال کے فانوسوں‌کی روشنی اس کی آنکھیں برداشت نہیں کرسکتی ، ہرطرف عورتیں اورلڑکیاں رقصاں ہیں اور ان کے قیمتی لباس ان کی مرکیوں سے گھوم رھے ہیں . ان عورتوں کی آنکھوں سے ھوس اور شھوت برس رہی ھے. شراب کے ہرگھونٹ سے ان کے ھونٹ سرخ تر اور پرشھوت ترھوتے جاتے ہیں اور وہ ایک خاص اداسے اپنے ھونٹوں کواپنے سفید رومالوں سے صاف کرتی جاتی ہیں. میں‌اس خانہ بدوش کی سرگرداں آنکھوں کو دیکھتا ھوں جو ان عورتوں کو کاغذ کے سفید، نرم ونازك رومالوں کوٹوکری میں ڈالتے ھوئے دیکھ لیتی ہیں. میں‌اس طرح کڑاھوا اس خانہ بدوش کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈالتاھوں اور آہستہ سے پوچھتاھوں:

- تمہارانام کیاھے ؟

مسکراتی اور شرماتی ہوئی جواب دیتی ھے:

- موسکا.

اس ہال میں مہماں مرد اور عورتیں لڑکے اور لڑکیاں کھڑے بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے باتیں‌کرنے میں مصروف ہیں. ایک طرف دیکھتاھوں کہ ایک شخص ایک عورت کی گردن میں جس کے سنہرے بال ہیں اپنے بازو حمایل کردیتاھے اورباٹوں‌کے دوران اس کو چومتابھی جاتاھے :میں دل ہی دل میں سوچھتاھوں: کاش یہ منظر موسکا نہ دیکھے! لیکن میں دیکھتاھوں کہ موسکا کی پیشانی شرم وحیاسے بھیگ چکی ھے. دوسری طرف دیکھتاھوں کہ ایک جواں شخص ایک لڑکی کی حنائی رنگ کے بالوں سے ہٹ کیلیاں کرتاھوا اس کے کان میں اپنی محبت کانغمہ الاپ رہاھے. میں‌موسکاکی خمارآلود آنکھوں کی طرف دیکھتاھوں اور ایسا لگتاھے کہ اس کی آنکھیں ایک نقطہ پرمرکوز ہیں. شاید وہ اپنے آپ کچھ سوچھ رہی ھے. وہ اپنا گھڑا اٹھائے درے کی طرف جارہی ھے. جہاں ایک گڈریادرخت سے ٹیک لگائے بانسری سے ایک غمگین نغمہ الاپ رہاھے. موسکاآہستہ آہستہ ان کی طرف جاتی ھے. گڈریا بانسری بجانا بند کردیتاھے اوراٹھتا ھوا اس کی طرف بڑھتاھے لیکن جیسے ہی موسکا اس کی یہ پیش روی دیکھتی ھے وہاں سے بھاگ جاتی ھے اور گڈریا گانے لگتاھے کہ «اس درے کاہرپودا دواھے کیوں کہ ان سے لڑکیوں کی چادریں چھوگئی ہیں». وہ

موسکا کے پیچھے دوڑتاھے.

میں دیکھتا ھوں کہ موسکا کے ھونٹ لرزنے لگتے ہیں جیسے کہ وہ نیند سے جاگ گئی ھو،وہ تیزی سے اپنی پلکیں جھپکاتی ھے. ایک مست لڑکی کے ہنسنے سے جوکسی جواں لڑکے کی ہنسادینے والی بات پربہت زورسے قہقہہ لگاتی ھے میری خیالوں کاسلسلہ ٹوٹ جاتاھے. موسکا میری طرف دیکھتی ھے اورپوچھتی ھے:

-کیابات ھے ؟

مجھے بھی نہیں معلوم کہ اسے کیاجواب دوں.میں اسے ایک مرتبہ پھر آواز دیتاھوں:

- باہر آجاؤ نا!

اس مرتبہ جیسے کہ اس نے جرئت پیدا کرلی ھو، آہستہ آہستہ شرماتی ھوئی میرے نزدیك آجاتی ھے. اپنے پھٹے ھوئے میلے ہاتھوں کو اپنے چادر میں چھپالیتی ھے.اس کے ہاتھوں سے گوبرکی بدبو آرہی ھے.وہ جس طرف بھی دیکھتی ھے ادھرسب عورتوں،مردوں ،بوڑھوں اور جوانوں کے سفید سفید ہاتھ خوشبوؤں سے بھرے ھوئے نظر آتے ہیں . اس وقت وہ اپنے میلے ہاتھوں سے شرماتی ھے. اس کی نگاہ جہاں بھی پڑتی ھے دیکھتی ھے کہ ان سب کے ہاتھوں میں وہسکی سے بھرے ھوئے جام ہیں . آہستہ سے مجھ سے پوچھتی ھے:

- کیا کوئی مجھے یہاں ایک گیلاس پانی دے گا؟ میں بہت پیاسی ھوں.

میں اس کے لئے پانی لاتاھوں . وہ مجھ سے منہ پھیر لیتی ھے، اپنی سرپرہاتھ رکھتی ھے، پانی پیتی ھے اور خداکاشکرادا کرتی ھے. اپنی میلی آستین سے ھونٹ صاف کرتی ھے اور مجھ سے آہستہ سے پوچھتی ھے:

– یہ کون ہیں؟

میں ادھر دھر دیکھ کرمطمئن ھوجاتاھوں کہ کوئی مجھے دیکھ تونہیں رہا، اورکہتا ھوں کہ :

– یہ سب غیرملکی ہیں.

اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے اس سے ٹھیک بھی کہاھے یانہیں،کیوں کہ وہ ان سب چیزوں سے ناآشناھے. اس کی ماں نے اسے ایک لمبے سفرمیں مقر کے دشت سوزاں میں جنم دیاتھا اور جب سے اس نے ھوش سنبھالاھمیشہ خشک کانٹوں سے بھری ھوئی وادیاں، پہاڑاوردریا دیکھے یا سیاہ رنگ کے خیمے اور اونٹوں کے کارواں . میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتاھوں لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ : یہ غیر ملکی بھی انسان ہیں لیکن ان کے ہاتھ اتنی پاک صاف کیوں ہیں ،ان کے لباس اس قدر نئے کیوں ہیں، ان کے ہاتھ ان کے چہرے کیوں اس قدر سرخ وسفید ہیں، ان کے بچوں کے ہاتھ کیوں پھٹے ھوئے نہیں ہیں، ان کے جسموں پرپھٹے ھوئے کپڑے کیوں نہیں ہیں، ان کے رنگ ایسے سرخ وسفید کیوں ہیں؟ اوراسی طرح کے بہت سارے سوال. ہرشخص کو وہ گھبراکردیکھتی ھے .عورتوں کے زیورات بجلی کی تیزروشنی میں چمک رھے ہیں.گلے کے ھار سفید سفید گردنوں میں اورسونے کی باریک چوڑیاں ہاتھوں میں بہت دلکش معلوم ھوتی

ہیں. کیوں کہ یہ خود بھی عورت ہے ، اس کی نگاہیں زیورات پر جم جاتی ہیں اور حیرت سے اس کا منہ کھلا رہ جاتا ہے .میں اس سے پوچھتا ہوں.

-باہر نہیں چلوگی؟

وہ فوراً ہی مان جاتی ہے اور کہتی ہے کہ :

- یہاں میرا دم گھٹا جاتا ہے ، چلو باہر چلیں!

میں چاہتا ہوں کہ اسے اس بلڈنگ کی آٹھویں منزل سے لفٹ کے ذریعے نیچے لاؤں. ہم دونوں لفٹ میں داخل ہوتے ہیں.اس کی آنکھوں میں بد گمانی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں لیکن میں اسے اطمینان دلاتا ہوں کہ اس مشین سے جلدی نیچے جا سکیں گے. وہ پوچھتی ہے :-یہ کیا ہے ؟

اس سے پہلے کہ میں اس کے سوال کا جواب دیتا ، لفٹ نیچے جانے لگتی ہے. تعجب اور ڈر سے موسکا کے گلے سے گھٹی ہوئی آواز نکلتی ہے لیکن میں اسے بتاتا ہوں کہ یہ لفٹ ہے اور بجلی سے چلتی ہے.

اس کی اب بھی سمجھ میں نہیں آتا اور میں بے دھیانی میں اس کے پیر پر پیر رکھ دیتا ہوں.وہ چیختی ہے :

- تم نے تو میرا پیر ہی کچل دیا!

میں دیکھتا ہوں کہ اس کا میلا پیر میرے پیر کے نیچے آگیا ہے. ہم دونوں لفٹ سے نکل کر بازار میں داخل ہوتے ہیں. ایک چوڑی سڑک ہے ، موٹریں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی ہیں ، سڑک کے دونوں جانب خوبصورت اونچی اونچی عمارتیں کھڑی ہیں ،.بجلی کے سائن بورڈ چمک رہے ہیں، میں ان کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں :

((ستارہ کیفے، سنہرے مرغے کا تھیٹر، مولن روژ عیش کی دنیا، علاوالدین کا دیا، سنہرا...)) اور موسکا میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیتی ہے. وہ ڈرتی ہے کہ میں کہیں گم نہ ہوجاؤں. دکانوں کے شیشوں سے عورتوں کی تصویریں نظر آتی ہیں. بجلی کے قمقمے جل اور بجھ رہے ہیں. کیفے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں. بھنے ہوئے مرغ شیشوں کے پیچھے سے رکھے ہوئے نظر آتے ہیں. میں دیکھتا ہوں کہ موسکا کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور وہ اسے نگل جاتی ہے. کچھ قدم آگے شہوت انگیز برہنہ عورتوں کی تصویریں لگی ہوئی ہیں. میں کوشش کرتا ہوں کہ موسکا انہیں نہ دیکھ پائے لیکن اس کی نگاہ ان پر پڑ جاتی ہے اور وہ شرم سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے اور مجھ سے بھی کچھ نہیں کہتی. داہنے ہاتھ کی طرف ایک تنگ و تاریک گلی ہے. میں دیکھتا ہوں کہ وہاں کچھ نیم برہنہ عورتیں ہیں اور ہر آنے جانے والے پر کوئی گندہ جملہ اچھال دیتی ہیں. اس بار موسکا انہیں برداشت نہیں کر پاتی اور مجھ سے ہنستے ہوئے پوچھتی ہے:- یہ یہاں پر کیا کر رہی ہیں؟

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اسے کیا جواب دوں. جھوٹ بھی بول نہیں پاتا. فقط اتنا کہتا ہوں کہ :

- یہ بری عورتیں ہیں.

اسے یاد آتا ہے کہ ایک بار وہ اپنے باپ کے ساتھ بنگال میں کسی شہر میں گئی تھی . اس نے ایسی عورتوں کو دکھاتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بری عورتیں ہیں.

میں اطمینان کاسانس لیتاھوں اوراپنے دل میں کہتاھوں کہ:

- خداکاشکرھے اس جھنجٹ سے نجات ملی.

تقریباً شام ھوچکی ھے اورہم آہستہ آہستہ شہرکے مرکزسے گاؤں کی طرف چلنے لگتے ہیں.

سویٹزرلینڈخود ایک خوب صورت جگہ ھے اورخاص طورپرشہر((لوزاں)). جیسے ہی آپ چھوٹی سڑکوں سے گذریں، آپ کی نگاہیں سرسبزپہاڑیوں پرپڑتی ہیں جودرختوں سے بھری ھوئی ہیں. ان پہاڑیوں پرجگہ جگہ کج مج سڑکیں بنی ہیں، پہاڑیوں پر، ٹیلوں پر لکڑی کے گھر نظر آتے ہیں.یہ گاؤں خاص طور پر بہت خوب صورت ھے. اس جنگل کو دیکھتاھوں. موسکا نے میرا بازو پکڑاھواھے. میں اس سے ان گاؤں اورٹیلوں کے بارے میں باتیں کرتاھوں. بارش کی بوندیں گرنے لگتی ہیں اور موسکا اپنے آپ کو اپنی سیاہ چادر سے ڈھکتے ھوئے مجھ سے کہتی ھے :

-مجھے سردی لگ رہی ھے !

میں اس سے کہتاھوں:

-جلدی ہم ایک گرم جگہ جائیں گے اور وہاں کچھ کھائیں گے.

وہ مجھ سے پوچھتی ھے :

- کیا یہاں بھی لڑکیوں کی شادی زبر دستی کردی جاتی ھے ؟

میں تعجب سے پوچھتاھوں:

- کیامطلب ؟

وہ جواب دیتی ھے!

- ہم خانہ بدوشوں میں رواج ہے یا تو لڑکی کی بچپن میں ہی منگنی کردیتے ہیں یا پھر زبردستی اس کی شادی.

- تعجب کی بات ہے!

- کیا تمہیں اپنے ملک کے بارے میں کچھ معلوم نہیں؟

میں جلدہی اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ:- ایسا ہی ہے. لیکن حقیقت میں میرا دھیان ادھر نہ تھا اور میں بھولا ہوا تھا کہ اس وقت میری انجل میرے انتظار میں آنکھیں بچھائے ہوئے ہوگی.

موسکا مجھ سے کہتی ہے:

- میری باپ نے بھی میری منگنی اپنے بھتیجے سے بچپن میں کردیتی تھی. شاید کچھ عرصہ بعد ہماری شادی ہوجائے.

اگرچہ میری بیشتر توجہ ادھر ادھر سرسبز جنگل، ٹیلوں اور پہاڑیوں پر بنے ہوئے مکانوں کی طرف ہے لیکن پھر بھی میں موسکا کی بات پر دھیان دیتا ہوں. اس لمحے مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ سارے گھر سیاہ خیمے بن گئے ہیں. ان گاؤں پر پھیلے ہوئے پہاڑ سے اٹھتے ہوئے سفید بادل مجھے ایسے لگے جیسے کہ ان خیموں میں سے دھواں اٹھ رہا ہو. مجھے اپنے وطن کے بچوں کی زندگی یاد آجاتی ہے اور میں تصور کرتا ہوں کہ یہ دھواں اس آگ سے بلند ہو رہا ہے جو روٹی پکانے والی توے کے نیچے جل رہی ہے...

حسد کرتے ہوئے موسکا سے پوچھتا ہوں:- تمہارا آدمی خوبصورت ہے؟

اپنی پیشانی پہ بل ڈالتے ہوئے وہ کہتی ہے:

- ایسا خوبصورت جیسے آدم خان درخانے کا آدم خان.

کنکھیوں سے مجھے دیکھتی جاتی ہے. شاید اسے میرے حسد سے لذت مل رہی ہو.موسکاکہتی ہے:-بلندقدکالے بال، بڑی بڑی آنکھیں ، بھری بھری بھویں ، خوبصورت چہرہ، پھیلاھواسینہ ،نوکیلی مونچھے...

میں اس کی ساری باتوں کواپنی ذہن میں مجسم کرتاھوں. میں موسکاسے پوچتھاھوں :- اس کانام کیاھے ؟

- کجیر.

میںایک بار پھرکجیرکی تصویرکواپنی ذہن میں مجسم کرتاھوں اورایک مرتبہ دیکھتاھوں کہ یہی کجیرخیمے کے برابر میں کھڑاھوا، بندوق لئے میری طرف نشانہ باندھ رہاھے. میری سمجھ میں نہیں اتاکہ کیابات ھے. لیکن تعجب سے دیکھتاھوں کہ موسکا میراہاتھ چھوڑکر خیمے کی طرف بھاگتی ھے. میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیاھوا.موسکا کاچہرہ اس کی سیاہ رنگ کے چادر میں آہستہ آہستہ دور اور چھوٹا وتا چلاجاتاھے. میں اپنا چہرہ اس جواں خانہ بدوش کی طرف کرتاھوں اور وہ اسی لمحے مجھ پرفائر کرتاھے.اس کی بندوق کی نالی سے خاکی رنگ کا دھواں نکلتاھے.

اس جواں کے فائر کی آوازسے میں ھوش میں آجاتاھوں اور جب میں اپنا رخ ہال کی طرف کرتاھوں تودیکھتاھوں، موسکا کاچہرہ اس فریم میں مسکرارہاھے.

ہال میںمردوں اورعورتوں کے قہقھے بکھرے ھوئے ہیں اور ایک طرف ایک ویٹر شمپین کی بوتل کھول کرمہمانوں کے جاموں میں شمپین انڈیل رہاھے.

دیوارکی دراڑ

آسماں پربادل چھائے ہوئے تھے .کچھ کالے سفید مرغ اورمرغیاں لکڑی کے زینے پر ایک لائن میں بیٹھی ہوئی سورہی تھیں .کالے رنگ کی بلی غمناک آواز میں میاوں میاوں کررہی تھی اور اس کی آواز گہری خاموشی کے پردے کوچاک کررہی تھی. حبیب نے جوابھی ابھی کام سے لوٹاتھا، پانی سے اپنے ہاتھ منہ دھونے لگا. اس کی ماں اس طرف ایک مجسمے کی طرح حیراں پریشاں کھڑی تھی اور طبق معمول کسی چیزکی طرف بھی متوجہ نہ تھی .حبیب نے اسے آواز دی:

- ماں ، ماں.....!

ماں نے جواب دیا:

- ہاں ماں صدقے جائے!

حبیب نے پوچھا:

-آج رات کھانے کوکیاھے ؟

ماں نے پھر اسی طرح جواب دیا:

- ہاں ماں صدقےجائے.

حبیب نے پھر شکایت آمیز لہجے میں کہا:

- ماں میں تجھ سے کیا پوچھ رہاھوں اور تو کیا جواب دی رہی ھو!

اس کی ماں نے پھر جواب نہ دیا جیسے کہ اس نے کچھ سناہی نہ ھو.حبیب نے ذراغصے سے آواز دی: ماں!

ماں کو ایک جھٹکا لگا. اس کی تصورات کی دنیامیں ارتعاش پیدا ہوا جیسے کہ وہ گہری نیندسے جاگ گئی ہو ، اس نے پوچھا:

- بیٹے کہہ تو کیا کہہ رہاھے ؟

حبیب سمجھ گیا کہ اس کی ماں کسی اورہی حال میں ھے .وہ اس کے قریب آیا اور پوچھا:

- ماں کیاھوا ، کیا ٹوت گیا ، کیا ختم ہوا کہ توبول نہیں رہی ؟

ماں بولنا ہی چاہتی تھی کہ اس کی آنکھ پھیکے باریك چاند پر پڑی جوکہ صحن کے ببری کی درخت کے شا خوں کے پیچھے سے جھانك رہاتھا. وہ فوراً چلاتی:

- حبیب بیٹے جلدی پانی لے کرآ!

حبیب دوڑکہ باورچی خانے میں گیا اور اپنی ماں کے لئے کٹورے میں صاف پانی لے کرآیا. اس نے دیکھاکہ اس کی ماں نے آنکھیں بالکل بند کئے ہیں اور کسی کودیکھنا نہیں چاہتی . حبیب نے حیرانی میں آواز دی:

- ماں،لوپانی لے آیا!

ماں نے کٹورے کو اپنی انگلیوں سے چھوا اور اسے ہاتھوں میں پکڑلیا . اس کے بعد اس کی آنکھیں پانی کو دیکھتے ہوئے کھولیں اور اس نے دل ہی دل میں کچھ پڑھا.اسی لمحے ملاکی اذان جوخدا کی بزرگی بیاں کررہاتھا سنائی دی. حبیب کی ماں نے اپنے ہتھیلیوں پرنظرڈال کرکلمہء شہادت پڑھتے ہوئے کہا:

- حبیب بیٹے! میں نے تیری خوش قسمتی دیکھی ، نئے چاند کو پانی

میں دیکھا ، خوشحالی ہوگی ، خداتجھے لمبی عمر دے گا اور تیری مرادیں برآئیں گی.

اس کے بعد اس نےاپنے بچے کاسراپنے سینے سے لگالیا اوراس کے سر پراپنا ہاتھ پھیرا . اسی وقت اس کی نگاہ سفید بالوں پر پڑی جواس کی قلموں میں سے کہیں کہیں جھانک رہے تھے .تقریباً چیختے ہوئے اس نے کہا:

- نہ بیوی نہ بچے ، نہ کچھ کھایا ، نہ کچھ دیکھا، توتومیرے بیٹے بڈھا ہوگیا!

حبیب نے کہا:

- خدا نہ کرے ماں،کیا ہوا؟

ماں نے جواب دیا:

- تیراسربھی تیری ماں‌کی طرح سفید ہوگیا ، اللہ توبہ،یہ کیسا وقت آگیا ہے ؟

حبیب نے اپنا سراٹھایااور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی ماں کے کند ھے جواس کے قدکے مقابلے میں بہت پست تھے پکڑتے ہوئے غرور سے کہا:

- ماں یہ بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے ،جاگنے سے ، چراغ کی روشنی سے اورپڑھنے کی وجہ سے سفید ہوئے ہیں. جب تک مرد زحمت نہ اٹھائے ، مرد نہیں بنتا.

اس کی ماں نے کہا:

- ہاں بیٹا ، میں سمجھتی ہوں. شکرکہ تومرد ہےلیکن جب میں نے

پہلی دفعہ تیرے سفید بال دیکھے تو مجھے رونا آگیا۔

حبیب کو دھکا لگا۔اس نے اپنا چہرہ ماں کی طرف سے موڑلیا۔ایک دو قدم اس سے دور چلا گیا۔اس کا جی چاہا کہ روپڑے زور زور سے روئے لیکن شرم سے اس کی آواز گلے میں گھٹ گئی ۔ اس نے یہ شعر پڑھتے ہوئے:

موے سفید را فلکم رایگاں نداد

این رشتہ را بہ نقد جوانی خریدہ ام

(زمانے نے مجھے یہ سفید بال مفت میں نہیں دئے بلکہ میں نے ان کو اپنی نقد جوانی دے کر خریدا ہے)ماں کو مخاطب کیا لیکن ماں نے حبیب کی بات ہنسی میں ٹال دی کیوں کہ وہ سمجھتی تھی کہ حبیب اتنا بڑا نہیں ہے جتنا کہ اپنے آپ کو بنا رہا ہے۔دونوں چپ ہوگئے ۔ اگر بولتے تو ہوسکتا تھا کہ کسی راز سے پردہ اٹھ جاتا اور یا کوئی غم تازہ ہوجاتا ۔ حبیب نے بات بدلی اور کہا:

- ماں کچھ اور بات کر۔

ماں نے کہا:

- میرے بیٹے میں کیا بات کروں؟ کون سی بات کروں؟ میں تو بوڑھی ہوگئی بالکل بوڑھی مرغی کی طرح بوڑھی کڑکڑاتی اندھی مرغی کی طرح۔

اسی وقت ڈھول تاشوں کی آوازیں اور ہنسی کی فوارے پڑوس سے سنائی دئیے۔ اس گھر میں پڑوسی کی لڑکی کی شادی کا جشن تھا۔ وہی لڑکی جس سے حبیب کو پیار تھا لیکن اس نے کسی سے بھی اس کا ذکر نہ کیا تھا۔حبیب نے اشارے سے پوچھا:

- ماں پڑوس میں‌کیا ھوا؟

- ماں نے جواب دیا:

- کچھ نہیں .لیلاکی شادی ھے . ہمیں انھوں نے نہیں بلایا .ہمیں‌اپنے برابر تھوڑی سمجھتے ہیں.

حبیب کاچہرہ فق ھوگیا .بالکل چونے کی طرح سفید لیکن اس نے اپنے دل میں کہا:

-ہاں لیلاکی شادی ھے ، ہمیں کیا!

لیکن ماں نے حبیب کے حال کونہ دیکھاکیوں کہ اسے اپنا ماضی یاد آگیا .جوانی کی یاد پینتالیس سینتالیس سال پرانی باتیں جب عورتیں‌اس کی ماں کے پاس آتیں اور درخواست کرتی کہ ان کے لڑکے کو اپنی غلامی میں لے لے . اس کے بعد اسے باجے گاجوں کی آوازیں‌آنے لگیں کہ وہ دلہن بنی ھوئی اپنے دولہا کے ساتھ شہرسے گذررہی تھی اورلوگ نئی پرانی گھوڑوں گاڑیوں پرسوار ان کے ساتھ چل رھے تھے . کچھ ہی لمحے بعد اسے یاد آیا کہ کس طرح وہ پہلی بار اپنی سسرال میں داخل ھوئی،اسی جگہ جہاں اس کی مرادوں کی منزل تھی .اسی وقت پڑوسی کے گھرسے گانے بجانے کی آوازیں زیادہ آنے لگیں.

کوئی بہت ہی افسردہ آواز میں گارہی تھی:

- چھوڑ بابل کاگھر،مجھے پیاکے نگر آج جاناپڑا.

حبیب نے پوچھا:

- یہ لوگ کیا گارھے ہیں؟

ماں نے طنزیہ طور پر جواب دیا:

- وہی کہہ رہے ہیں کہ : چھوڑبابل کاگھر مجھے پیاکے نگر آج جانا پڑا. .حبیب نے کہا:

- یہ دنیا عجیب ہے!

ماں نے کہا:

- ہاں میرے بچے ،ایسی ہی بات ہے. قسمت کالکھاہوکے ہی رہتاہے.

حبیب نے کہا:

- درست کہتی ہوماں، ڈھول کی آواز دورسے ہی بھلی لگتی ہے.

اس وقت اسے اپنا باپ یاد آیا. وہ باپ جسے اس نے کہیں سڑک پرکبھی کسی چوراہے پردیکھا تھا اور جس نے بڑی سرد مہری سے اس کے سلام کاجواب دیاتھا .اس کی نگاہ اپنی ماں کے ہاتھوں پر چلی گئی، وہ ہاتھ جن سے اس نے ساری عمر جھاڑودی ، برتن دھوئے ، کپڑے دھوئے اور سلائی کی تاکہ اپنے بچے کاپیٹ بھرسکے. اسے اپنے باپ کی کمی محسوس نہ ہو اور اسے سوتیلی ماں کے طعنے نہ سنناپڑے. اپنی کم حیثیتی پراسے رونا آگیا اوراپنا ماتھا اس طرح دیوار سے ٹکا جیسے منت کررہاہو.اس کی ماں اس سے ذرا دورکھڑی رورہی تھی. حبیب نے بے اثر باتوں سے ماں کی آنسوؤں کوروکنانہ چاہا. وہ سمجھتاتھا کہ یہ آنسوں ہزاروں رنجدیدہ عورتوں کاوہ قیمتی سرمایہ ہے جومردکی ہوس کاشکار بن کراپناسب کچھ کھو بیٹھتی ہیں اور اس کی ماں کو ان کی قدر کرنا چاہئے. اسے لڑکیوں کی ہنسی سنائی دی جووہ دلہن کو اس کے کمرے میں لیجارہی تھیں.اس کے وجود

میں آگ لگ گئی اور اس کاجسم اس میں جھلس کرہ گیا۔ اس کاجی چاہاکہ ایک دم لیلاکودیکھ کراپنی آنکھوں کوٹھنڈی کرے لیکن گھر کی وہ چھوٹی دیوار ان کے بیچ میں ایک پہاڑ بن گئی .اس کے دل میں آیاکہ : یہ کیا زمانہ آگیا کہ مجنوں تودیوارکے اس طرف اپنی جان دے رہاھے اور دیوار کے اس طرف اس کی لیلاہے فکرکسی اورکے ساتھ خراماں خراماں جارہی ھے!

اس نے زورسے اپنا سردیوار سے پھٹکا، ناخونوں سے دیوار کونوچالیکن کوئی فایدہ نہ ھوا. اس کی سمجھ میں آگیا کہ سب کچھ ختم ھوگیاھے اور زندگی میں کچھ باقی نہیں رہا. اس کی آنکھ درخت کے گڈھے پر پڑی جواسے پھانسی کے پھندے کے لئے مناسب معلوم ھوا لیکن اس کی ماں جو دیوار کوٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی متوجہ ھوئی کہ دیوارمیں دراڑ پڑگئی ھے . وہ زورسے چیخی :

- حبیب بیٹے، دیوار میں دراڑ پڑگئی ،گرنے والی ھے، دیوارسے دورھوجا! اورحبیب حیراں پریشاں اس دیوارسے دورھوگیا، جتنے دورکہ ھوسکتاتھا!

فرشتے کاشکار

میری بیٹی باورچی خانے میں کھڑکی کے نزدیك کھڑی ہوئی تھی. میں پیاز کاٹ رہی تھی اور وہ اپنی گول آنکھوں سے برف گرنے کودیکھ رہی تھی . اس کے انہماك کودیکھ کرمیںنے محسوس کیاکہ اسے آہستہ آہستہ زمیں پرشان سے آتے ہوئے برف کے گالے بہت ہی اچھے لگ رھے ہیں . مجھے ایسالگاکہ اسے برف باری نے بالکل مسحورکردیاھے. اس نے میرادامن پکڑتے ہوئے کہا:

- برف کو آسماں سے کون لاتاھے ؟

میرے منہ سے نکلا: ملك

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تومیں نے اضافہ کیا: برف کے ہرایک گالے کوایک ایک ملك آسماں سے زمیں تك لےکرآتاھے.

اس نے پوچھا: ملك کون ہوتے ہیں؟

میںنے کہا: ملك یعنی فرشتے .

چند دن پہلے ہی میری بیٹی چار سال کی ہوئی تھی . فرشتوں کی اس کوکچھ کچھ سمجھ تھی . فرشتوں کی تصویریں اس نے ان تصویروں والی کتابوںمیں دیکھی تھیں جومیں نے اس کے لئے ادھرادھرسے بہت مشکل سے اکٹھاکی تھی.فرشتے جوکہ خوبصورت سفید سفید پروںوالے ہوتے ہیں بغیر یقین کئے ہوئے حیرت سے اس نے پوچھا:

- ہرایک گالے کوایک ایک فرشتہ زمیں پہ لاتاھے ؟

میں نے کہا: ہاں.

وہ کھڑکی سے برف کوگرتاھوا اچھی طرح نہیں دیکھ پارہی تھی. ایک دم دوڑی ہوئی گئی اورجاکے کچھ تکئے اپنے ساتھ لائی اور ان کوزمیں پررکھ کران پرکھڑی ہوگئی .اس کاقد ان تکیوں کی وجہ سے اونچاھوگیاتھا. اس نے اپنے منہ کوکھڑکی کے شیشے سے لگالیا اورذوق وشوق کے ساتھ برف کے گرنے کودیکھتی رہی. خاموش تھی. میں نے اپنی آنکھوں کوجوپیاز کی جھل سے جلنے لگی تھیں مشکل سے کھولااوراپنی بیٹی کی طرف دیکھا.مجھے ایسا لگاکہ وہ برف کے ہرگالے کے ساتھ ایک خوبصورت سفیدبالوں

والاموجود کو دیکھ رہی ھے جوزمیں پہ آرہاھے. اسے ایسا نظر آرہا تھا کہ گویا پوری فضاان خوبصورت سفید بالوں والے موجودات سے جنھوں نے ان برف کے گالوں کو اپنی آغوش میں لے رکھاھے، بھرگئی ھے .میری بیٹی نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: - تھکتے نہی ہیں؟

میں نے کہا:- نہیں.

پھراس نے کہا:- کاش میرے بھی سفید پر ہوتے، میں بھی برف لاتی، کتنا اچھا لگتا!

اس کے بعد وہ زورسے ہنسی. اس کی ہنسی کی آواز مجھے پسند آئی.

پیاز کاٹتے ہوئے میں چھبیس سال پہلے کی باتیں سوچھنے لگی. مجھے یاد آیا کہ ایک دن میں نے بھی اپنی دادی ماں سے یہی پوچھا تھا اور اس

نے جواب میں کہا تھا کہ : برف کے ہر ایک گالے کو ایک ملک زمین پہ لے کر آتا ہے۔

میں بھی حیران ہو کر ان سے پوچھا تھا: یہ تھکتے نہیں ہیں؟

اس کے جواب میں دادی ماں نے کہا تھا: نہیں۔

اس کے بعد میں نے پوچھا تھا: ملک کون ہوتے ہیں؟

پہلے تو دادی ماں حیران ہو گئی تھی لیکن بعد میں حسرت سے انہوں نے کہا تھا:

ہم ملک کو دیکھ نہیں سکتے لیکن وہ ہر جگہ ہوتے ہیں۔

اور میں نے بے اختیار ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھا تھا اور مجھے کوئی نظر نہ آیا تھا اور دادی ماں نے مزید کہا تھا: ابھی جو تم بیٹھی ہو، ایک ملک تمہارے سامنے ہے، ایک تمہارے پیچھے، ایک تمہارے دائیں کندھے پر اور ایک تمہارے بائیں کندھے پر۔

میں نے فوراً ہی آگے پیچھے، دائیں بائیں کندھوں کو پھر سے دیکھا تھا لیکن مجھے کوئی نظر نہ آیا تھا اور مجھے میرے چاروں طرف ان نہ نظر آنے والی موجودات کی بھیڑ سے کچھ وحشت ہوتی تھی۔ اس پر میری دادی ماں نے کہا تھا: اگر آدمی اچھا کام کرے تو اسے داہنے کندھے والا ملک لکھتا ہے اور اگر برا کام کرے تو بائیں کندھے والا۔ مجھے ڈر لگا تھا اور ایسا محسوس ہوا تھا کہ میرے چاروں طرف نہ نظر آنے والی موجودات بیٹھی ہیں اور سرسر میرے بارے میں لکھے چلے جا رہی ہیں۔ میں نے پھر پوچھا تھا: اس کے بعد ان کا کیا کرتے ہیں؟

– پھر یہ انسان کے نامہ، اعمال میں لکھ دیتے ہیں۔

– نامہ، اعمال کیا ہوتاھے؟

دادی ماں نے تسبیح کے دانوں کوگھماتے ہوئے آسماں کی طرف دیکھا۔ وہ آسماں بھی نظر نہیں آرہاتھا۔ برف کے گالے آہستہ آہستہ بڑی شان کے ساتھ زمیں پہ آرھے تھے اور انھوں نے کہاتھا: وہ چیز جوقیامت کے دن انسان کے کام آتی ھے ایک ورق ھے، انسان کے سارے کام اس میں لکھے ھوتے ہیں اچھے کام برے کام ،اگر اس کےاچھے کام زیادہ ھوں تووہ جنت میں جاتاھے اور اگربرے کام زیادہ ھوں تو وہ دوزخ میں جاتاھے۔

اس کے بعد انھوں نے آہ کھینچتے ھوئے کہا تھا: خدا مجھے دوزخ کی آگ سے بچائے! دوزخ میں گناہگاروں کو آگ کی گرزسے مارتے ہیں۔ انسان ٹکڑے ٹکڑے ھوجاتاھے۔ اس کے بعد چیونٹیاں ان ریزوں کو جمع کرکے ایک جگہ کردیتی ھے۔ انسان کاوجود پھرسے سالم ھوجاتاھے۔ پھرآگ کاگرز انسان کے سرپرمارتے ہیں۔ پھر آدمی ریزہ ریزہ ھوجاتاھے۔اورپھر۔۔۔ پیاس سے اس کاحلق سوکھ جاتاھے۔وہ پانی مانگتاھے لیکن کوئی اسے پانی نہیں دیتا۔ مجھے ایسا محسوس ھوا کہ دوزخ ایک بڑی شکنجے کی جگہ ھے جہاں ہرطرف انسان کے جلے ھوئے اور ریزہ ریزہ ھوئے ہاتھ پاؤں، سر،دھڑ پڑے ھوئے ہیں۔۔۔ بہت ہی ڈراوناتصور تھا اور اسی لمحے سے میرے تعلقات بائیں کندھے والے ملک بلکہ بائیں کندھے، بائیں پاؤں،بائیں ہاتھ سے خراب ھوگئے تھے۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے بائیں کندھے والاملک صبح سے رات اور رات سے صبح تک میرے بارے میں لکھتا جاتاھے اورکوشش کرتاھے کہ

مجھے دوزخ میں بھیج دے. اگر میں بڑوں کوسلام نہیں کرتی یااگرمیں بڑوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کرباتیں کرتی یااگر میں ان کی اچھی بری بات کی اطاعت نہ کرتی یا ان سے جراح کرتی یااگر پانی پیتی اورخدا کاشکر ادانہ کرتی اور اگر کوئی بڑاآتا اور میں ان کی عزت کے لئے کھڑی نہ ہوجاتی یا اگر میں کسی بڑے کا ہاتھ نہ چھومتی تومجھے ایسا لگتا کہ میرا کام خراب ہوہی جائے گا اور یہ میرے بائیں کندھے والاملك ایک اچھے رپورٹرکی طرح سڑسڑلکھ ڈالے گااور میرے اوردَوزخ کے درمیاں فاصلہ کم سے کم ترھوتاچلاجائے گا. کبھی کبھی میں ڈرسے دل نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا چہرہ بائیں کندھے کی طرف کرتے ہوئے گویا دوستی کے جذبے کے ساتھ مسکراتی. میں چاہتی تھی کہ بائیں کندھے والے ملك سے کہوں کہ تم مجھے پسند ہواور اس طرح سے اس کے ساتھ میرے تعلقات اچھے ہوجائیں یاکم سے کم وہ غلط یاضد میں اکر میرے خلاف کچھ درج نہ کرے. بائیں کند ھے والاملك میرے لئے ایک ہیولابن گیا تھا. دن تو کسی نہ کسی طرح گذرجاتا اورمیں اس کی طرف متوجہ نہ ہوتی تھی لیکن رات کو جب میں بستر پرلیٹتی اور لحاف سے منہ ڈھك لیتی، ان چیزوں کے بارے میں سوچھتی جو اس بائیں کندھے والے ملك نے لکھی ہوں گی . مجھے اپنی سانس کی اور دل کی دھڑکنے کی آوازیں سنائی دیتی. وہ سارے گناہ یاد آتے جومیں نے اس دن کئے ہوتے. میں پھر بھی خداسے دعا کرتی کہ خدا کرے اس نے غلط باتیں نہ لکھی ہوں، ضد میں آکے کچھ نہ لکھاہو، یا ایسے ویسے کچھ نہ لکھ لیا ہو. میں دعا کرتی بس وہی لکھا ہو جو میں

نے کیا ہے... لیکن اگراسے یہ کام یاوہ کام سمجھ میں نہ آیا ہو تو کیا ہوا ہوگا! کاش وہ مجھ سے پوچھ لیتا....پھر اس کے بعد لحاف میں لیٹے لیٹے میں‌خود سے وعدہ کرتی کہ کل سے بڑوں کوسلام کروں گی، ان کا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کربات نہیں کروں گی، ان کی ہربات مانوں گی، ان سے جراح نہ کروں گی، اگر پانی پیوں گی تو خدا کاشکرادا کروں گی، اگر کوئی بڑآئے تو اس کے احترام میں کھڑی ہوجاؤں گی، بڑوں کے ہاتھ چوموں گی لیکن پھر میں اپنے آپ سے پوچھتی اگر یہ بائیس کندھے والاملک ضد میں آکر ساری غلط سلط باتیں لکھ لے اور قیامت کے دن اکڑکے کھڑاہوکر زور زورسے پڑھنے لگے تو کیا ہوگا؟ پھر میں سوچھتی کہ آگ کاگرز میرے سرپرپڑے گا اور میں ذرہ ذرہ ہوجاؤں گی۔ اس کے بعد چیونٹیاں میری ذروں کو جمع کریں گی اور میرا وجود سالم ہوجائے گا، میں سوکھے حلق سے پانی مانگوں گی لیکن کوئی مجھے پانی نہیں دے گا، پھرآگ کاگرز مجھ پر پڑے گا اورمیں ریزہ ریزہ ہوجاؤں‌گی۔ ڈرسے میں لرزتی، لحاف کے نیچے مجھے پسینے آتے، میراتکیہ بھیگ جاتا اور ہر رات اسی وحشت اورڈرکے ساتھ میں سوجاتی۔

میں باورچی خانے میں کھانا پکانے میں مصروف ہوگئی ۔ تلی ہوئی پیازکی خوشبو سب جگہ پھیل رہی تھی۔ میں نے دیکھا میری بیٹی نے تکئے وہاں سے اٹھائے اور ان کوایک اورکھڑکی کے نیچھے رکھا تاکہ برف باری کوزیادہ اچھی طرح دیکھ سکے۔ پھر اس نے کھڑکی کوکھول کراپنے ہاتھ باہر نکالے۔ ایک برف کاگالہ اس کے ہاتھ پر پڑا، خوشی سے چیختے ہوئے

اس نے کہا: ایک فرشتہ میری ہتھیلی پر بیٹھا ہے! وہ جلدی جلدی میرے پاس آئی، اس کی مٹھی بند تھی،اس نے کہا: جانتی ہو، میری مٹھی میں فرشتہ ہے؟

اس نے اپنی مٹھی کھولی.ایک پانی کا قطرہ اس کی ہتھیلی سے لڑھکا.اس نے کہا:

- دیکھا تم نے ؟ اڑ گیا چلا گیا تاکہ اور برف لائے. دیکھا تم نے؟

میں نے کہا: نہیں.

اس نے اصرار کرتے ہوئے کہا: میں نے اسے دیکھا.

میرا دامن پکڑتے ہوئے اس نے التجا کی:

- میرے لئے دو سفید پر خرید دو!

میں نے کہا: اچھا خرید دوں گی.

- کب؟

- کل

اس نے پوچھا: کتنے میں دیتے ہیں؟

- میں نے کہا: معلوم نہیں .

اس نے اپنی جیب میں جلدی سے ہاتھ ڈالا اور ایک سکہ باہر نکالتے ہوئے کہا:- میرے پاس خود پیسے ہیں. چلیں پھر؟

میں نے کہا: میں نے تم سے کہا کہ کل خریدیں گے.

اپنی گردن کو ایک طرف کرتے ہوئے ہی حوصلگی کے ساتھ اس نے کہا:

-کل تو ابھی ہو گئی ، چلو ابھی چلیں!

میں نے کہا : -کچھ تو صبر کرو ،میں اپنا کام ختم کرلوں۔

وہ اچھلی، زور سے ہنسی ۔میں نے حیرت سے اسے دیکھا. وہ دوڑتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی. شاید میں حسرت سے اس ممکنات کی دنیا کی طرف دیکھ رہی تھی.ایسی دنیا کوجہاں ہرقسم کی آرزوکی جاسکتی ہے .جہاں سب کچھ سوچاجاسکتاہے ،سب کچھ کہا جاسکتاہے اورسب کچھ ممکن ہے.ایک ایسی دنیاکی طرف جس میں بہت سے آنے والے کل موجود ہیں.آنے والا کل آج ہے. ابھی ہے. میرا دل ٹوٹ گیا۔

مجھے یاد آیا کہ دیر سے وہ دوسرے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوئی فرشتوں کاشکار کررہی ہے. مجھے ڈرلگاکہ اسے سردی نہ لگ جائے اور رات کوواسے کھانسی نہ اٹھنے لگے .میں نے اسے باورچی خانے سے آوازدی: کھڑکی بند کردو ٹھنڈ لگ جائے گی!

اس نے کہا: نہیں بند نہیں کروں گی۔

میں نے پھرکہا: میں کہہ رہی ہوں کہ کھڑکی بند کردو!

اس نے پھرکہا: نہیں نہیں کروں گی، میں برف کودیکھ رہی ہوں۔

میں گئی اورجاکرغصے میں کھڑکی بند کردی اور باورچی خانے میں واپس آگئی. میں نے پھر کھڑکی کھلنے کی آواز سنی. معلوم نہیں کیسے مجھے دادی ماں یاد آگئی. ملک کے قصے یاد آگئے. میں نے اس سے کچھ نہیں کہا.نہ جانے کتنی دیرتک وہ کھڑکی کھولے ہوئے فرشتوں کواپنی مٹھی میں گرفتار اور رہاکرتی رہی. معلوم نہیں اسے سردی لگی یاتھک گئی کہ میرے پاس آگئی.لیکن اس نے کچھ نہیں کہا،مجھے خوشی ہوئی

کہ بازار چلنے اور سفید پر خریدنے کو وہ بھول چکی ہے .ایک دم اس نے پوچھا:- پہلے آپ نے کیا کہا تھا؟

میں نے کہا: مجھے یاد نہیں میں نے کیا کہا تھا.

اس نے کہا:فرشتہ نہیں بلکہ کچھ اور تم نے کہا تھا.

میں نے کہا: ملک .

- ہاں ملک ، ملک بھی فرشتے کا نام ہے؟

اور اب میں نے ایک دم ملک کا قصہ اسے سنایا .میں نے اس کو بتایا کہ ایک ملک انسان کے سامنے ، ایک اس کے پیچھے ،، ایک اس کے دائیں کندھے پر اور ایک اس کے بائیں کندھے پر ہے. میں نے کہا کہ اگر آدمی اچھے کام کرے تو جنت میں جاتا ہے اور اگر برے کام کرے تو دوزخ میں.میں نے کہا کہ اگر انسان بڑوں کی باتیں نہ مانے ، ان کے ہاتھ نہ چھومے ، ان سے جراح کرے پانی پیئے اور خدا کا شکر نہ کرے ، بڑوں کے احترام میں کھڑا نہ ہو تو اس کے بائیں کندھے کا ملک ان سب باتوں کو اس کے نامہ اعمال میں لکھ لیتا ہے اور پھر اس انسان کو دوزخ میں بھیج دیتے ہیں. پھر میں نے اسے آگ کے گزر کا، جسم کے ریزہ ریزہ ہونے کا ، ریزوں کو جمع کرنے کا ، پیاس سے حلق کے سوکھنے کا، پانی مانگنے اور پانی نہ ملنے کا قصہ سنایا . میری باتیں ختم ہونے پر بھی میری بیٹی میری طرف دیکھتی رہی ، میں اس کے گول چہرے اور لمبی لمبی چوٹیوں کو دیکھ رہی تھی ، اس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا ایک دم وہ دوسرے کمرے میں گئی اور جا کر اس نے کھڑکی بند کر دی.

اس نے اور کچھ نہ کہا ، خاموش ہو گئی، اس کی چلبلاہٹ ختم ہو گئی

تھی، آج اس نے کھاناآرام سے کھالیااور ہررات کی طرح کوئی جھگڑانہ کیا.جب اسے نیندآنے لگی، ہررات کی طرح میرے پاس آئی، میں نے اس کے کپڑے تبدیل کئے، اس سے پیارکیا، لوری سنائی، دعامانگی .میںاسے سلانے کے لئے ایک ۔ ۔ سنائی تھی .ہررات اس کاسرسہلاتے ہوئے اس کوتھپکتے ہوئے کہی:

- خداکرے خواب میں تمہیں چاندتارے نظرآئیں .. پھول پتے نظرآئیں میں نظرآؤں!

اس کے جواب میں وہ ہنس کرکہتی: تم تونظر آؤگی ہی.

آج رات کوبھی یہ کہتے ہوئے وہ اپنی بستر پرلیٹ گئی. میں نے اس کامنہ لحاف سے ڈھک دیااور وہ اکیلی ہوگئی.

# # #

رات زیادہ گزرچکی تھی. میں نے اپناکام ختم کیااورہر رات کی طرح اپنی بیٹی کودیکھنے گئی. میں نے دیکھاوہ بے چین تھی.اس سے پہلے جب بھی میں لوری سناتی، اس کو اس کے بستر پرلٹاتی اورلحاف سے اس کاسرڈھک دیتی وہ فوراً سوجاتی لیکن آج جب میںنے اس کے چہرے سے لحاف ہٹایا میں نے دیکھا اس کوایک جھٹکالگا. وہ سوئی نہیں تھی .اس نے میری طرف دیکھا. اس کی خواب آلود آنکھوں میں وحشت پنہاں تھی. شاید وہ بائیس کند ھے والی ملك سے ڈر رہی تھی . اپنے نامہء اعمال کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اس بائیس‌کندھے والے ملك نے غلط سلط اوریا ضد میںآکر کچھ اورنہ لکھ دیاھو. # # #

ادھورے راستے

وہ آئینے کے سامنے سے پرے ہٹ گئی. اس نے سوچا کہ اتنا ہی میک اپ کافی ہے. اس نے اچھا میک اپ کیا تھا اور جب بھی وہ میک اپ کرتی تو اس کا چہرہ ہی بدل جاتا. اس کا اصلی حسن میک اپ سے دوبالا ہوجاتا اور اس حالت میں جو کوئی بھی اسے دیکھتا، اس کے دل میں یہی خیال آتا کہ : اے کاش میرے پاس اتنے پیسے ہوتے کہ اس پر ان کی بارش برسادیتا.

بخشے ایک نرم ونازک جواں عورت تھی. آج وہ دیر تک آئینے کے سامنے اپنا میک اپ کرتی رہی اور جو بھی میک اپ کا اچھا سامان اس کے پاس تھا اس نے اس سے استفادہ کیا. اس قدر میک اپ اس نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا. اس کے شوہر نے اس سے کہا تھا کہ : اچھی طرح میک اپ کرنا. آج ((مہمان))آنے والے ہیں.

بات در اصل یہ تھی کہ آج خاص ((مہمانوں)) کو آنا تھا. دولتمند ((مہمان)).وہ بھی ایک چھوڑدو دو ایسے جو دولتمند ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب اعتبار بھی تھے اور ان کی جیبیں پیسوں سے بھری ہوئی تھیں یہی وجہ تھی کہ اس کے شوہر نے اس سے تاکید کی تھی کہ وہ اپنے آپ کو خوب بنائے سنوارے، خوب گائے خوب ناچے خوب پیسے بٹورے خوب نازو ادا دکھائے اور جس طرح بھی ممکن ہو ان کی جیبوں سے پیسے نکلوالے، اسی وجہ سے آج اس نے دیر تک میک اپ کیا. مہمان دوسرے کمرے میں اس کا انتظار کررہے تھے. اگر چہ اس کا شوہر کئی مرتبہ اس کے کمرے میں آیا

لیکن اسے میک اپ میں مصروف دیکھ کر صرف اتنا ہی کہتا کہ ((وہ آگئے ہیں)) اور کمرے سے چلا جاتا۔ بختے نے اور اپنے آپ کو سجایا۔ آئینے میں غور سے دیکھا۔ اسے میک اپ مکمل نظر آیا۔ اس نے اور بھی غور سے اپنے چہرے کو دیکھا۔ ایک مرتبہ اسے اپنا بچپن یاد آگیا۔ وہ زمانا یاد آگیا جب وہ بچی تھی۔ اس کی ماں بھی اسی طرح سجتی بنتی تھی اور وہ حیران ہو کر اسے دیکھا کرتی تھی۔ جس وقت ماں کمرے میں نہ ہوتی، وہ آئینے کے پاس کھڑی ہو کر اپنی ماں سے چھپ کر اس کے میک اپ کے سامان کو استعمال کرتی۔ ایک روز اس نے اپنا چہرہ خوب سرخ کر لیا تھا، اپنے ہونٹوں کو بھی رنگ لیا تھا اور جب اس کی ماں آئی تو اس نے اس کی اچھی طرح سے مرمت کی۔ وہ رونے لگی چلانے لگی....

بختے کو ایک دم ہوش آگیا۔ وہ آئینے کے سامنے بیٹھی ہوئی رو رہی تھی۔ اسی لمحے اس کا شوہر کمرے میں آیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور آہستہ آہستہ اس کی طرف چلنے لگی۔ جس وقت ((مہمانوں)) کے کمرے میں وہ داخل ہوئی کمرہ طرح طرح کی خوشبوؤں سے بھر گیا۔ اس کی گھنگروؤں کی جھنکار سے دلوں کے تار بجنے لگے۔ اس کے شوہر کے مونچھوں پر تبسم پھیل گیا۔ جب بھی بختے کا شوہر اسے ایسا سجا بنا دیکھتا تو وہ پھولے نہ سماتا اور سوچنے لگتا کہ : اگر ایسے ہی کام چلتا رہا تو میں بادشاہ بن جاؤں گا۔ یہ خوبصورتی ،یہ نازوادا ،یہ ناچ ...یہ مرکیاں ...اور یہ سب دولت ...آخر کار ان سب سے میں بادشاہ بن جاؤں گا۔

اس کے بعد اس کے دل میں اور خیال آنے لگتے۔ مہمانوں کے موٹے پیٹ

کاخیال، ان کی بھری ہوئی جیبوں کاخیال اوراس کے خیالات فقط ان کی جیبوں پرہی جم کررہ جاتے اس کی زندہ گی کے سارے خیالات صرف انہیں جیبوں سے وابستہ تھی۔ ان بھری ہوئی جیبوں کے بارے میں سوچھنا اس کی زندہ گی کامقصد تھا اوروہ ہمیشہ انہیں کے بارے میں سوچھتا تھا۔ اس بارے میں کہ کیسے انہیں خالی کرے۔ جس دن سے بختے اسے ملی تھی وہ اس کے ہاتھ سے نکل نہ پاتی تھی اور اسے لوگوں کی جیبیں خالی کرنے کاایک اچھابہانا ہاتھ آگیا تھابلکہ اب تو اسے اس مقصد کے لئے صرف یہی راستہ نظرآتاتھا۔

بختے کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان دو((مہمانوں))کے دل مچلنے لگے۔ ان کے رنگ اوربھی سرخ ہوگئے اور وہ دونوں بختے کے ناز و اداکے شکارھوگئے۔ آج بختے کے نازو ادامیں عجیب لوچ تھا۔ گذشتہ سے زیادہ لوچ۔ آج اس کے حسن میں نہ معلوم کیسی مستی تھی کہ اس کے نازو نخرے عجب قیامت ڈھارھے تھے۔ اسے معلوم تھاکہ مہمانوں کی جیبیں پیسوں سے بھری ہیں۔اس نے بھی اسی طرح اپنے حسن کونازواداسے اور دلکش بنالیا تھا۔ کچھ ہی لمحے بعد سازچھڑنے لگے۔ کمرے کی فضا مستی سے بھرگئی،ہارمونیم کی تانیں جاگ اٹھیں۔ طبلے بھی تھرکنے لگے۔گھنگروؤں کی آوازوں نے ھوا میں مستی بکھیر دی۔ بختے اپنی جگہ سے اٹھی اور جس قدر بھی اچھا ناچ سکتی تھی ناچی۔ پھر کچھ لمحے دم لینے کے لئے رکی۔ دم لیتے ہوئے بھی نازو انداز دکھاتی رہی۔ پھراس کے نازو انداز لوگوں کی جیبوں پراثر انداز ہوتے اور ہرے ہرے لال لال رنگ

کے نوٹ ان سے باہر بختے کے سرپربارش برسانے لگے. کمرے کافرش نوٹوں سے بھرگیا.بختے ان پرتھرکتی رہی اورجب اس کی نگاہ نوٹوں کی فرش پر پڑتی وہ ناز وادا سے اپنی زلفوں کوھوا میں لہراتی اوراس کے ناچ میں اورہی جان پڑجاتی. جب سے بختے کمرے میں داخل ہوئی تھی .((مہمانوں))کی نگاہیں ایک لمحے کے لئے اس سے دورنہ ہوئی تھیں. وہ فقط بختے کودیکھ رھے تھے اور اس پرنوٹوں کی بارش کرتے جارھے تھے. ہرہرلمحہ بختے کاناچ اور بھی دلکش ہوتاجارہاتھا. اس کی ہرہرادامیں ایک خاص بانکپن تھی اور ہرلمحہ وہ حسن سے حسین ترھوتی جارہی تھی.اسے دیکھ کراس کے ((شوہر))کادل خوشی سے اوربھی زیادہ دھڑکنے لگا. وہ پلکیں جھپکا جھپکا کردل ہی دل میں بختے کوشاباش کہہ رہاتھا.

بختے دیر تک ناچتی رہی اور اس کے بعد وہ رک گئی. بختے کا شوھر کمرے سے باہر چلاگیا. نوازندے بھی طبلہ وہارمونیم وغیرہ لے کرکمرے سے نکل گئے . بختے ان لوگوں کے پاس کمرے میں تنہا رہ گئی. کمرے کافرش اب بھی اسی طرح نوٹوں سے بھراھوا تھا. بختے کبھی ان کے موٹے موٹے پیسوں کودیکھتی اورکبھی فرش پر پھیلے ہوئے نوٹوں کواورکبھی ان کی بھری ھوئی جیبوں کو.چند لمحے بعد بختے کا شوھر دوبارہ کمرے میں آیا، اس نے فرش پرسے نوٹ جمع کرلئے. ان کے نیچے سے کمرے کا بدنمافرش دوبارہ نظر آنے لگا. اس نے کچھ اشارے سے ((مہمانوں))سے کچھ کہا اور کمرے سے نکل گیا. پھروہ کمرے میں نہ آیا بختے ان مہمانوں کے ساتھ اکیلی رہ گئی ہمیشہ ہی سازوآواز، رقص وموسیقی کے بعد اسے اکیلا

((مہمانوں))کے پاس چھوڑدیا جاتاتھا. یہی اس کی زندہ گی تھی یہی اس کاکام تھا.((مہمانوں))کی جیبیں چاھے کتنی بھی نوٹوں سے بھری ھوتیں بختے کے سامنے آکر خالی ھوجاتیں اور جب وہ یہاں سے لوٹتے توایک نوٹ بھی ان کی جیبوں‌میں نہ رہتا. یہی بختے کاکمال تھا اور اس کمال کواس کے شوہر نے اسے سکھایاتھا. بختے کا شوہر عجیب آدمی تھا. قد کاچھوٹا اور عمر بختے سے کہیں بڑا. بختے اس کے سامنے اس کی لڑکی لگتی. بختے نے اپنے دورسے لے کر آیا تھا.وہ اس کا فقط نام کا ((شوہرتھا)). اس کی ساری ارزو یہ تھی کہ بختے کے ذریعے دولت اکٹھی کرے . شوہر کایہ کام اب بختے کابھی کام بن گیاتھا. بختے کواس کی ماں نے اس کے سپرد کیاتھا. اس کی ماں بھی ایسی ہی تھی اور اس کاباپ بھی ایسا. وہ سب لوگوں کی جیبوں‌کوخالی کرنے پرجیتے ، وہ جیبیں جوپیسوں سے بھری ھوتیں .بختے کی زندہ گی اسی طرح گذر رہی تھی. جیبوں کوخالی کرنے پروہ جی رہی تھی . اپنے آپ کوبیچتی جاتی اور زندگی گذارتی جاتی. زندگی کوبیچنا اور اس پر زندہ رہنا ہی اس کامشغلہ تھا. جب اس کا شوہر اسے اس شہرمیں‌لایاتھا تو بختے سوچھ رہی تھی کہ اب وہ واقعی اس کاشوہر بن جائے گا اور وہ ماں باپ کے گھروں والی لعنت سے دور ھوجائے گی لیکن حالات نے ایک دم پلٹا کھایا اور اس نے اپنی زندگی کوبیچ بیچ کرجینا شروع کردیا. اس زندگی کی اسے عادت پڑگئی اور آہستہ آہستہ یہ جی بھی لگنے لگی اوربعد میں‌یہی اس کی زندگی بن گئی.

شائق رقاصہ بن گئی ایک حسین رقاصہ،دلکش نازو اداکی مالک

کبھی کبھی اسے ایسا لگتاکہ اس کاشوہر اس کامالك نہیں ، بلکہ وہ اپنے شوہر کی مالك ھے. بختے کی یوں ہی زندگی گزرتی رہی اور اس کاشوہر اس پرجیتا کیوں کہ اسکے وجود کاانحصار فقط بختے پرتھا. اسے اپنی خوش نصیبی بختے میں نظر آتی تھی. اب اسے یہ خوش نصیبی دولت کی شکل میںبھی نظر آنے لگی. اس کی جیبیں آہستہ آہستہ پیسوں سے بھرنے لگیں، پھر ان کی رفتار میں ایک دم سے تیزی آگئی. اس کی جیبیںبڑی ہوگئیں اور جلدی جلدی بھرنے لگیں. وہ تیزی سے مالدار ہوگیا اور اسی تیزی سے اس کی خوشی اور اس کے موٹا پے میں بھی اضافہ ہوتا چلاگیا. جب اسنے اپنی بھری بھری جیبیں نظر آتیںتو اپنے آپ کواور بھی موٹا محسوس کرنے لگتا. بھری ہوئی جیبیںانسان کواسی طرح موٹا بنادیتی ہیں. یہ خیال اسے اور بھی موٹاکردیتا . اس کی جیبیں پھولتی جاتیں او وہ خودبھی. ایسے ((مہمانوں))کی آمد روز روز اس کے یہاں زیادہ ہونے لگی.جیبیں خالی کرنے میں بھی تیزی آگئی. اب ہرطرف بختے کی حسن کاچرچاتھا.اس کامیك اپ غضب ڈھاتا. اس کی رقص کی ہرجگہ شہرت تھی اور اس کی خوشبواس کے گھرسے دور دورتك پھیل گئی تھی. اب بختے اپنی شہرت کے عروج پرتھی. اب وہ ہرایک کے دسترس میں نہ تھی اورہرکوئی اس تك نہ پہنچ پاتاتھا. بختے اب محدود طبقے کی قسمت بن گئی تھی، خوش قسمتوں کی قسمت، صاحب اقتداروں کی قسمت جوزیادہ موٹے ہوتے ، ان کی جیبیں بھی اتنی ہی موٹی ہوتیں. بختے ان ساری خوشیوں کی مالك خود کوسمجتھی اور اس کاشوہر بھی ساری خوشیوں کواپنا

سمجتھا. یہ تیزی چلتی رہی. یہ بختے کی حسن، اس کےنازوادا، اس کے رقص کاعروج تھا. اس حسن کے پرستار بہت تھے اور اس کی قیمت بھی بہت تھی.اونچی تھی .اس کے ((شوھر)) کی جیبیں اور بھر تی گئی اور نوٹوں سے پھولتی گئیں لیکن عجیب بات تھی. بختے آہستہ آہستہ بجھنے لگی کبھی اس کے بجھنے کی رفتار تیز ھوجاتی اور کبھی سست .عجیب چیز تھی. اس کاشوہر حیراں تھا.یہی تعجب کی بات تھی ! جیبیں بڑھ رہی تھیں اور بختے گھٹ رہی تھی. ایسا معلوم ھوتا تھا کہ یہ ساری تیزرفتاری بختے کے وجود کوگھلارہی تھی. وہ دن بدن چھوٹی سے چھوتی ھوتی چلی جارہی تھی. اس کے ساتھ ایک عجیب اتفاق ھواتھا جیسے کہ وہ قسمت کی غلام ھو. بختے گھل گئی تھی. رفتار کی تیزی نے اسے اور گھلادیاتھا ایسا جیسے کہ وہ اچانك کسی چھت سے نیچے گرگئی ھو.قسمت کی چھت سے ، خوش قسمتی کی چھت سے ، حسن کی شہرت کی چھت سے نیچے گرگئی ھو. قسمت کی چھت سے ، خوش قسمتی کی چھت سے حسن کی شہرت کی چھت سے بھری ھوئی جیبوں کی چھت سے . بختے ان ساری چھتوں سے ایک دم گری تھی. جس تیزی کے ساتھ اس کے حسن نے دوسروں کے چراغ گل کردئے تھے اسی تیزی کے ساتھ وہ خود بھی ان کاشکار ھوگئی اوراس کی شہرت اورنام اس کے لئے آگ کے شعلے بن گئے.اس کے بعد بختے بیمار ھوگئی. اس کی بیماری شدید سے شدید ترھوتی گئی. اچانك وہ ایک دن ختم ھوگئی. ایسا لگا جیسے اس کے شوہر کی قسمت بھی بختے کے ساتھ چلی گئی. وہ بد بخت ھوگیا. بھری ھوئی جیبیں اس کے ساتھ ساتھ چلی گئیں.

اور اس کی بھری ہوئی جیبیں ہرہرلمحے خالی ہونے لگیں. بختے کومیك اپ اور نازو ادانے تباہ کردیا. بھری ہوئی ابلتی ہوئی بڑی جیبوں نے اس کوبد بخت کردیا. وہ سوچتی تھی کہ یہ جیبیںاس کے لئے خوش نصیبی لاتی ہیں لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ ان راستوں سےفقط بدنصیبی حاصل ہوتی ہے.... ان ادھورے راستوں سے... بختے کی بدقسمتی کے ادھورے راستے... بختے انہیں بد بختی کے راستوں میں چلی گئی. انہیں ادھورے راستوں میں.

* * *

بختے کے کمرے میں پھرسے خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں. پھرسے اس گھرمیں دو((مہمان)) آئے تھے. اس کے ((شوہر)) کے گھرمیںان کی جیبیں بڑی اوربھری ہوئی تھیں. ان کی جیبیوں سے نوٹ ابل رہے تھے اس کا شوہر دوبارہ کمرے میں آیا.وہ پھرسے بہت خوش تھا.پھرسےمیك اپ جاری تھا. خوشبوئیں اور زیادہ ہوامیں رچی ہوئی تھیں. جب اس کا شوہر کمرے میں داخل ہوا، اس کی مونچھوں پرتبسم پھیل گیا اوراس نے مسکراتے ہوئے کہا: وہ لوگ آگئے ،جلدی کرو.

آج ایک دوسری بختے اپنے آپ کو بناسنوار رہی تھی.

\# \# \#

ادھوراکھیل

دن نکلاہی تھا.سورج کی گرم شعائیں ہرچیزکواپنی حرارت بخش رہی تھی. چڑھیاںنئے دن کااستقبال کرتے ہوئے درختوں کے شاخوں پرچہچہارہی تھیں اور گاوں والے اپنے روزمرہ کے کاموں میں لگے ہوئے. گاؤں کے بچے بھی ہرروز کی طرح اپنے کھیلوں میں مصروف ہوگئے.احمد اور رضیہ اس گاوںکے ایک قلعے کے آمنے سامنے والے دوکسان گھرانوں کے بچے تھے. اس دن صبح رضیہ نے اپنے کھلونوں اور گڑیوں کی پٹھاری بغل میں دبائی،صحن سے پھٹی ہوئی چھٹائی اٹھاکرگھرسے باہرچلی گئی .سامنے والے گھرکے دروازے سے ہی اس نےاپنے بچپن کے ساتھی احمدکواوازدی.اس کے بعد یہ دونوں ، آزاد پرندوں کی طرح قلعے سے باہرکی طرف چلنے لگے.

قلعے کے سامنے بچے کھیل رھے تھے.ان میں سے کچھ جھولا جھولنے میں مصروف تھے اور کچھ لکڑی کی موٹر چلانے میں اور کچھ بچے سناپوکھیل رھے تھے. ایک بچی قلعے کی دیوارسے لگی ہوئی اپنے چھوٹے بھیاکے ساتھ کھیل رہی تھی، کچھ بچے آنکھ مچولی میں مشغول تھے اور کچھ احمد اور رضیہ کی طرح قلعے سے باہر آرھے تھے.

احمد اورضیہ نے دروازوے سے نکل کردھوپ میں قلعے کی کچی دیوار کے ساتھ اپنی چھٹائی بچھائی، چھٹائی کے چاروں طرف انھوں نے ٹھیکروں اور پتھریوں کی مدد سے دیواریں بنائے اور اس طرح انھوں نے اپنے لئے

چھوٹا ساگھر بنایا.

رضیہ نے اپنے کھلونوں کی پٹھاری کھولی. گڑیوں کے بستر نکالے اور اپنے بنائے ہوئے گھرکی دیوار سے لگاکر چھٹائی پر بچھادی.دوگڑیوں کوجن میں سے ایک لڑکااور دوسری لڑکی نظر آرہی تھی، کھلونوں کی پٹھاری میں سے نکال کر ان بستروں پر بٹھادئے.احمد نے اپنے باپ کی شادی کی پرانی چادر اس چھٹائی پر ڈالی اور اس پر بیٹھ گیا.رضیہ نے احمد سے کہا:

احمد، قریب آجاتاکہ کھیل شروع کرے. تواتنی دورکیوں بیٹھاھے ؟

احمد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا:

-کون ساکھیل کھیلے ؟توتو اپنی گڑیوں سے کھیل.

رضیہ کو اپنی ماں باپ کی باتیں اور گھرکے کام یاد آگئے .اس نے پھراحمد سے میٹھی میٹھی باتوں سے کہنے لگی:

-اب جب ہم نے گھر بنالیاھے تو آ، ہم ماں باپ کاکھیل کھیلے .میں اپنے چھوٹے بچے کودودھ پلاؤں گی اور تو کھیت پرکام کرنے جا... ہل چلاکہ گیہوں کی بوائی کاوقت آگیاھے...روٹی پکاکر میں تیرے پاس اپنے لڑکے کے ہاتھوں کھیت پربھیج دوں گی.

اس نے یہ باتیں کرتے کرتے اپنی چھوٹی گڑیاں کواپنی گودمیں بٹالیا اور لوری سنانے لگی.

احمد آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھا. اس نے اپنی چادر کو جھٹکااور اپنی کمرکے چاروں طرف باندھ لیا. اس نے ایک چھوٹی ٹہنی کوجو ان کے بنائے

ادھوراکھیل

ہوئے گھرکی صحن میں پڑی تھی اپنے کندھے پررکھی اور رضیہ سے کہا:

-پھرمیں ہل چلانے جارہاھوں کیوں کہ گیھوں کی بوائی کاو قت آگیا ھے.

اس کے بعد وہ گھرسے باہرکی طرف چلا، دروازے پر پہنچتے ہوئے اس نے رضیہ کی طرف مڑ کردیکھا اور کہا:

- روٹی بھیجنابھول مت جائیو!

اس نے یہ جملہ اس جذبے اور محبت سے اداکیا جیسے کہ یہ کھیل نہیں ،بلکہ حقیقی زندہ گی کاحصہ ھو. اپنی بات مکمل کرکے وہ گھرسے نکل گیا.

رضیہ نے گڈ ے سے جوکہ دیوار سے ٹیك لگائے بستر پر بیٹھاتھا،کہا:

سنو، شرارت مت کرنا. تمہاری بہن سو رہی ھے.مجھے بہت کام ھے، گھرمیں جھاڑودینی ھے، روٹی پکانی ھے اور...

رضیہ نے ابھی یہ بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ ایک خوفناك دھماکہ ھوا، بجلی چمکی اورپھر بجھ گئی...

اس کے بعد نہ وہاں گھرتھا، نہ گھر کانشاں اورنہ رضیہاور احمدکاپتہ. اس جگہ صرف مٹی کے تودے تھے اور دھوئیں آسماں کی طرف اٹھ رھے تھے. ان کاکھیل ادھورا رہ گیا لیکن سورج ابھی چمك رہاتھا.

# # #

کالاگھوڑا

خان پہاڑی کے نیچے سے دکھائی دیا .اس نے سفید رنگ کاچپن (شیروانی کی طرح کااوورکوٹ) پہناھواکالے رنگ کے گھوڑے پرسوارتھا .بوڑھے اخروٹ کی درخت کے نیچھے گاؤں کے ماسٹر جی نے کچھ بچوں کوجمع کیاھواتھا اورسبق پڑھانے میں مصروف تھے . خان نے گھوڑے کی لگام پکڑکرچند قدم تك کھینچااور ہرگالی جواسے یاد تھی اس نے ماسٹرجی کودی، یہاں تك کہ اس کی طرف تھوکا .اس کی باتوں سے صرف اتنا سمجھ میں آتا تھا کہ کل ماسٹر اس کے بچے کوپڑھانے نہیں گیاتھا .

خان کاکالاگھوڑا درے میں جانے لگا اور بچے جوکہ چڑیوں کے بچوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے تھے ، دیکھنے لگے کہ کس طرح سے پنھریاں گھوڑے کی پیر کے نیچے آ آکے ٹوٹ رہی ہیں،کس طرح سے گھوڑے کی رانوں میں حرکت پیدا ھورہی ھے اور ان کودیکھ کربچوں کے دل ،ڈرسے بیٹھنے لگتے .

درے کے آخرمیں جہاں پرخان کی پن چکی تھی، بوڑھاپن چکی والااپنی میلی کچیلی قمیض اتارے سہ پہرکی مری مری دھوپ میں ننگے بدن پن چکی کوصاف کررہاتھا . پچھلی رات سیلاب آگیا تھا اوراس کے ساتھ آئی ھوئی مٹی سے پن چکی کاحوض بھرگیاتھا .خان نے غصے سے اپنا گھوڑاپن

چکی والے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

- کیا تومرگیا تھا کہ پانی پن چکی میں گھس آیا؟

- نہیں جناب ،مجھے نیندآگئی تھی.

- اگر سونا ہی تھا، تو اپنی ماں کی گودمیں جاکرسوتا.

- خان تیری بھی ماں ھے.لوگوں کی ماں کے بارے میں بد زبانی نکر.

- اسے پکڑلواوردرخت سے باندھ لو.

گاؤں والے جو وہاں تھے وہ پیچھے ہٹ گئے اورکسی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا. پن چکی والے نے رات بھر ان سب گاؤں والوں کے ساتھ سیلاب سے ان کاسامان اور گھروالوں کے بچانے میں مدد کی تھی.

-پکڑلواسے اور باندھ دو!

پھربھی کوئی آگے نہ بڑھا.پن چکی والاایک قدم آگے بڑھااوراس پرخان نے قمچی ماری اور اس پرحملہ کردیا.

پن چکی والے کے دھوپ میں جلے ہوئے اورتقریباً سیاہ رنگ کے کندھوں پردباب قـــــــــمـــــــــچی پڑنے لگی لیکن وہ ایک درخت کی طرح کھڑارہا.ماسٹرجواخروٹ کی درخت کے نیچھے بچوں کو پڑھارہاتھا، اس نے سیاہ تختے پر لکھا:

- اگرایک گھوڑے کے ساتھ دوسراگھوڑاجمع کرو،توکتنے گھوڑے ہوئے؟

بچے جوابھی تک اس کالے گھوڑے کے بارے میں سوچھ رھے تھے زور سے بولے:

- دوکالے گھوڑے!

ماسٹرجی ہنسے اورکہا:

- اگران دوکے ساتھ ایک اورجمع کردو، توکتنے ہوئے ؟

ایک دوسرے بچے نے جواب دیا:

- تین کالے گھوڑے.

اسی طرح سے وہ دس کالے گھوڑوں تك پہنچے تھے کہ پن چکی والے کی آواز بجلی کی کھڑك کی طرح اس درے میں سنائی دی:

- مار،مار! آج تیرے ہاتھ میں قمچی ھے درندے.

اور اس پن چکی والے کی ماں کی فریاد کی آوازھرطرف پھیل گئی کہ کہہ رہی تھی:

- اے خدامیرے مدد کر! ہاے میرے بیٹے...ہاے میرے بیٹے کومارڈالا!

اس کی ماں کی فریاد کے ساتھ ٹھنڈی ھواکے جھونکے نے اخروٹ کے ھزاروں زرد سوکھے پتوں کوپتھروں پربکھیردیا.

ماسٹرجی کاچہرہ لٹك گیا. انھوں نے اپناسرچپن کے کالروں میں چھپاتے ھوئے جلدی جلدی تختے کوصاف کیااورکہنے لگا:

- نہیں نہیں... انہیں جمع نہیں کریں گے...تقسیم کریں گے...تقسیم.

ایک چھوٹا بچہ جس کے رگ رگ میں خوف وہراس بہرہی تھی،اس نے بھرآئی ھوئی آواز میں کہا:

- ان کالے گھوڑوں کوتقسیم مت کرو!

- پھرکیاکرے ؟

- انہیں مارڈالو.

ہرطرف خاموشی پھیلی ہوئی تھی، کسی پتے کے ہلنے کی آواز بھی نہیں آرہی تھی. ماسٹرصاحب اوربچے تصورمیں‌مرے ہوئے کالے گھوڑے کودیکھ رھے تھے اورسب سے چھوٹا بچہ تصورکررہاتھاکہ :

وہ پن چکی والاخان کی قمچیاں کھارہاھے. پھر ایک بڑا پتھر اٹھاکرخان پر مارتاھے .خان گھوڑے سے گرپڑتاھے اور اس کے ہاتھ گھوڑے کے سموں کی طرح زمیں‌پرٹك جاتے ہیں اورغلیظ خون اس کے بائیں ابروسے نکل آتاھے.

پن چکی والا جس کے کندھے قمچی کے مارسے نیلے پڑگئے ہیں غصے سے بھراھوا قہقہہ لگاتاھے.

گاؤں والے بھی اس کے قہقھے کے ساتھ ہسنے لگتے ہیں اوران سب کی ہنسنے کی آوازاس درے میں ہرطرف پھیل جاتی ھے ٹھنڈی ھواؤں کے جھونکے اخروٹ کے زرد پتوں کوپہاڑیوں میں بکھیردیتے ہیں‌اور چہچہاتی ہوئی چڑیاں اس درے کے آسماں پرادھرادھر اڑنے لگتی ہیں.

# # #

اھریمن دن میں بھی نظرآتے ہیں...

سیستان کے سیراب زمین میں پانی سے بھری ہوئی نہریں بہرہی تھیں اور چوپائے مستی سے ادھر ادھر چرتے پھر رھے تھے. ھلمند کاھاموں دریا سالھا سال سے اسی طرح سیستان میں رواں دواں تھا. زمینوں کوسیراب کرتاھوااور گل وسبزے کوشاداب رکھتاھوا بہرہاتھا.

آتش پرست اپنی عبادت اور زندگی کے کاروبارمیں مشغول تھے. گذشتہ تمام سالوں میں ان کے معبدوں سے سرخ آگ کے شعلے بلند ھوتے رھے. لوگ بھی اپنے اپنے کاموں میں‌لگے رھے. زرنج کاشہرلوگوں سے بھرا ھواتھا. انھوں نے بہادری سے ترکوں اور ساسانیوں کے حملوں کوپس پاکر دیا تھا اور ابھی ابھی وہ ان کی طرف سے بے غم ھوگئے تھے. زرنج کی حکمرانی کے اطراف میں رہنے والے قبیلوں کے سردار اپنے اپنے عوام کے ساتھ کھیتی باڑی میں‌لگے تھے. وہ مل کرپرانے گیت گاتے. ھاموں کا پاک تھا اور بعض لوگوں کے مطابق ھاموں دریا اھریمن کواپنے ساحلوں پر کھومنے نہیں دیتاتھا. اس زمانے میں زندگی سادی اورپاک تھی، لوگ پاک تھے .سورج دیوتاپاک تھا، پانی پاک تھااور سیستان کے دشت وصحرا، کھیت وکلیاں سب پاک تھے. مشقت کے کام بھی پاکی سے خالی نہیں تھے اور انسانوں کے منہ تک پاک تھے.

زردشت کے معبد روشن تھے. آتش پرست ان کی مقدس اگ کی روشنی میں‌اپنے آپ کوپاک صاف کرتے. معبد کے شعلے دشت وصحرا کو روشن کئے

ہوتے تھے اور اپنی روشنی سے سورج کے ساتھ ہمسری کرتے .حتی یہ کہ نور اورخوبصورتی کے ساتھ بھی .وہ لوگ سادہ لوح تھے ان کے دل پاک تھے . ہرچیزمیں ان کواچھائی اوربرائی، بھلائی اور، برائی خوش بختی اور بدبختی اہریمن اور اہورا کی جنگ نظرآتی تھی .

وہ اہریمن کوبلاسمجھتے تھے ، اسے وبا سمجھتے تھے ، اور اہورا کو شفا .ان سب کاعقیدہ تھا کہ اہریمن سورج کی روشنی میں نہیں ٹک پاتا اور بعدکی روشنی کے سامنے رکنے کا اس میں بوتانہیں ہے .

زمانے میں سیستان کاعلاقہ قافلوں اور کاروانوں کے لئے کھلا ہوتا یہ کارواں دن رات شہرودیہات ، دشت وصحرامیں سے آتے جاتے رہتے اک دل کسان کھیتی باڑی کی مشقت میں لگے رہتے . ساراسیستان سرسبز تھا . زرتشت بھی خوبصورت اوراپنی حسن میں ایکتاتھا . سورج کی کرنیں حیرانہ طورپرزمیں پرگررہی تھیں . لوگ پوپھٹتے ہی اٹھ جاتے تھے اور سورج کی پہلی کرنوں کے سامنے اس کی پاکی کی قسم کھاتے اور اس کے بعد اپنے اپنے کام پرچلے جاتے تھے . آتش پرستوں کے معبد سیستان کے ہر شہر میں ہمیشہ رہتے . چوپائے سیستان کے جنگلوں میں آزادی سے چرتے رہتے ہامون دریاکاپانی سورج کے کرنوں کے سامنے ہمیشہ مسکراتا رہتا .لوگوں کوستانا اہریمن کاکام سمجھاجاتھا .اہریمن سورج سے اپنے آپ کوچھپاتا ، اس کی روشنی میں نہ آتا اورمعبد کے شعلوں سے اپنے آپ کو چھپے رکھتا .وہ انصاف اور پاکی کی نورسے اپنے آپ کو بچاتا .لوگوں کی نیکی دیکھ کراسے بغیرچھپے یارا نہ رہتا .یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ

سمجھتے تھے کہ اھریمن دن میں نظر نہیں آتاھےلیکن ایک وقت وہ آیا کہ اھریمن طوفاں نے سیستاں کے لہلہاتے کھیتوں پرحملہ کردیا. گرد وغبار کے بگولے ھوامیں بلند ھونے لگے. طوفانی جھکڑ چلنے لگے اور انھوں نے معبدوں کی مقدس آگ کومغلوب کرلیا. لہلہاتے کھیت زمیں پرآگئے. ہامون دریاکاپانی کیچڑسے بھرگیا اور اس کے ساحل کی مٹی سے سورج کی چمک ماند پڑگئی. سب یہی سوچنے لگے کہ اھریمن ازھ کریہاں آگیاھے اوراپنے پنکھ ھوا میں لہلہارہاھے . وہ لوگ اپنے بارے میں سوچنے لگے کہ کیا ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ھوگیا؟ کیاایسا تونہیں کہ انھوں نے ایک دوسرے کی برائی چاہی ھو؟ یاشیطانی وسوسہ ان میں سے کسی کے دل میں گھر کرلیاھویایہ کہ اھریمن جنگ میں کامیاب ھوکیاھو اوراس نے اپنی ھوس کے طوفاں کوراہ دی ھو؟ کہیں ایسانہ ھوکہ وہ ان کے معبدوں کی مقدس آگ کوبجھانے میں کامیاب ھوجائے.... لیکن وہ سب کے سب حیراں تھے. طوفان سے پہلی والی خاموشی سیستاں کی دشت و صحرامیں پھیل چکی تھی اور ہرطرف سکوت کی حکمرانی تھی. مغرب کی طرف ڈھوبتے ھوئے سورج نے آسماں کوسرخ کردیاتھا.وہ سیستاں کے گاؤں پہنچا اور وہاں سے خراساں میں داخل ھوا.اس نے سارے دیہات کواچھی طرح گھوند ڈالا، اس نے سب سارے کھیت برباد کردئے . پانی کے بند توڑڈالے، گھروں اور جھونپڑیوں کوبرباد کردیا. چھوٹے چھوٹے بچوں کے سینوں کو برچھوں سے چھید کر رکھ دیا. انھوں نے بوڑھوں اور معذوروں کوقتل کردیا. ایسا لگتاجیسے وہ اپنا قرض وصول کرنے آیاھو. ان کی انکھیں ہمیشہ ہرطرف نوجواں لڑکیوں

کوتلاش کرتی رہتی . وہ اندھے ہوگئے تھے. شاید ان کامقصد یہی تھا. انھوں نے دولت کی لالچ میںگھروںکے کونے کھدروںکوچھان مارا اور اس طرح سے بہت سارے دیہاتوں کوانھوں نے لوٹ لیا. ان کے گھروں میں آگ لگادی اور بچوں کو جلاڈالا. انھوں نے بوڑھے لوگوں کوان کا گلاگھونٹ گھونٹ کرمارڈالا. نوجوانوں کے سرکاٹ دئے اور اس طرح سے شہروں اور دیہاتوں کوتباہ کرکے وہ چلے گئے. ان گاؤ ں اوردیہاتوں سے دھواں بھی بلند نہ ہواتھا کہ وہ آگے بڑھتےگئے.مغرب کے لشکر زرنج شہرکے نزدیك پہنچ گئے. انھوں نے مقدس موبدوں (آتشکدے کے پجاریوں) کومارڈالا ، معبدوں کی آگ کوبجھادیا.ان کی مقدس راکھ ادھرادھربکھرادی. شہروں کوغارت کردیا. ان میں گھوڑے ہنہنانے لگے گھرویراں ہوگئے. اپنے بڑے بڑے جبھے قبھے کے ساتھ گھروں میں داخل ہوئے اور بچوں کوقتل کردیا. بڑوں سے ان کاسینہ چھید دیا. بوڑھوں اور کمزوروں کومارڈالا.جواں لڑکیوں کو اذیتیں دیں، گویاکہ ان کاکام یہی تھا. انھوں نے جھپٹ لی اور پھرآگے بڑھ گئے. اسی طرح شہروں او دیہاتوں کوپیچھاچھوڑتے ہوئے اور زندگی کے آثار گم کرتے ہوئےآگے بڑھتے چلے گئے لیکن سیستان کابادشاہ ان کے سامنے نہ جھکا.اس کانام ایران بن رستم تھا. وہ اپنے آخری سانس تك لڑتارہا.اس کااعتقاد اھورامیں تھا اور اسے یقین تھا کہ اھورامعبدوںکی مقدس آگ کوکبھی خاموش نہیںھونے دے گا. وہ اس بات کی اجازت نہیںدے سکتا تھا کہ اس مقدس جگہ پراھریمن کامنحوس سایہ پڑے. لوگ اپنے کام کاج چھوڑ جائیں اور زندگی موت کی آغوش میں سماجائیں.وہ چاہتاتھا کہ

PROPERTY OF ACKU 6695

زندگی باقی رھے اور وہ چاہتا تھا کہ زندہ رہنے کے حق کادفاع کرے.اس نے عرب سردار کاسخت جانی سے مقابلہ کیا. ہرطرف خون بہنے لگے خون کی دریا بہنے لگے اور اس پرپن چکی چلنے لگی.کیوں کہ خون کی مقدار کم تھی اس لئے اس میں دریاکاپانی ملادیا گیا اور اس سے پن چکی چلنے لگی.زرنج کے حکمراں کوطلب کیاگیا.جنگ کے بعد اسے پکڑکرلایاگیا،اس کواوراس کے کچھ مریدوں کو، لیکن وہ اور ان کے ساتھی تیار نہ کوتیارنہ تھے کہ اھریمن روز روشن میں دیکھے جاسکتے ہیں. ان کے وہم وگماں میں بھی نہ تھا کہ ہامون کا مقدس پانی اھریمن کواپنے اوپرسے گزرنے دے گا.ان کویقین نہ آتاتھا کہ اھریمن سورج کی روشنی کے سامنے ٹك پائے گا.ان کویقین نہ آتاتھا کہ انہیں اھریمن دن میں دکھائی دے سکتاھے لیکن جب عربوں کے لشکر کے قریب پہنچا،بہت قریب پہنچا، اس نے اپنے کپڑے اتار دئے اور کھڑاھوگیا.اس کی آنکھوں میں چمك آگئی اور اس نے ایک عجیب حادثہ دیکھا.ایک ایسی چیز جس کااس کووہم وگماں بھی نہ تھا اور جسے دیکھنے کے لئے وہ آیا ہی نہ تھا. سیستاں کی زمیں پرفرش کی بجائے لاشیں بچھی ہوئی تھیں. سب کومارڈالا گیاتھا.ان کاقتل عام ھوا تھا.وہ ان سب کوپہچانتاتھا. وہ سب مقدس زرد دشتی تھے. وہ سب پاك انسان تھے. وہ جوکہ سیستان کی زمینوں میں کھیتی باڑی کرتے تھے. وہی اس وقت زمین پرہے حس وحرکت پڑے ھوئے سیستاں کی زمیں کافرش بن گئے تھے.عربوں کاسردارمردے جسموں کے ڈھیر پر بیٹھاتھا.اس نے بڑاساجبھاپہنا ھواتھا.اس کی سرخ سرخ آنکھیں نکل پڑی تھیں اورموٹے

موٹے ہونٹ نیچے کولٹکے ہوئے تھے. اس کے چہرے کارنگ ہلکاسانولاتھا، اس سے مستی کی بدبواٹھ رہی تھی ، اس کی آنکھوں میں‌صرف ثروت وشہوت نظرآتی تھی اوراس کے دل میں یہی سب کچھ تھا. اس نے سیستان کے لوگوں کومارڈالا تھا.سب کوتہ تیغ کردیاتھا.کسی کوزندہ نہ چھوڑاتھا. اس کے ہونٹ پیچھے کولٹکے ہوئے‌تھے . اس کی آنکھیں اب بھی مال ودولت کی تلاش میں‌ادھرادھرگھوم رہی تھی. اس کے دانت کبھی نہ ختم ہونے والی بھوک کے لئے موٹے موٹے ہونٹوں کے پیچے سے چمک رہے تھے. شہوت کا اس کے سر پرغلبہ تھا اور اسی طرح وہ سیستانیوں کی کھوپڑیوں‌پرٹیک لگائے لیٹاھوا تھا. سیستان کا حکمراں اپنے چند موبدوں کے ساتھ اس کے قریب آیا.وہ لوگ گھوڑوں سے اترے . ان کے ساتھ زرنج کے کچھ سردار بھی تھے .موبد بھی تھے. اس نے زمیں پرمردوں کے‌فرش کودیکھا جن سے زمین پٹی ہوئی تھی.ایک دم گھبراکر وہ زرنج کے معبدوں اوربزرگوں کی طرف مڑا. اس نے ابھی ابھی عربوں کے سردارکودیکھاتھا اورسیستاں کی زمیں‌کو جو سیستانیوں کے مردہ جسموں سے پٹی ہوئی تھی.

لرزتے ہوئے بے اختیاراس کے منہ سے نکلاتھا:

-کہتے ہیں کہ اھریمن دن میں‌نظر نہیں آتا..یہ ھے ، اسے دیکھو .اب تو یہ آنکھوں سے دیکھاجاسکتاھے...

ربیع (عربوں کاسردار) نے ترجماں‌کی زبان سے یہ بات سنی. اس نے ایک سردنگاہ سیستان کے حکمراں پرڈالی اور تلخی سے ہنس دیا.

# # #

INCOMPLETE GAME

A collection of Short Stories
(URDU)

Translated by :
A.Qayeum Karim And Sh.A.Quraishi

Printed at the Taj Mahal Press
July, 1995